ماسٹر برکت علی

نومبر ۱۹۵۶ء رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

ربیع الاول ۱۳۷۶ھ جلد ۴۷ عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵۔ اے، ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور، پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے قیمت فی پرچہ دس آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن

لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۷ | ربیع الاول ۱۳۷۶ھ مطابق نومبر ۱۹۵۶ء | عدد ۳

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلے ماہ مئی، جون اور جولائی کی اشاعتوں میں مسلم معاشرے کی اصلاح اور اسلامی نظام زندگی کی تعمیر کے متعلق ان صفحات میں جو سلسلۂ کلام چل رہا تھا، افسوس ہے کہ پے درپے سفر اور مسلسل مصروفیتوں کے باعث وہ جاری نہ رہ سکا۔ اب پھر کچھ فرصت بہم پہونچی ہے اور خیال ہے کہ دو تین اشاعتوں میں اسے مکمل کر دیا جائے۔

جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصلاح و تعمیر کے لیے ایک صحیح لائحۂ عمل جتنا ضروری ہے، اس سے بہت زیادہ ضروری ایسے کارکنوں کا وجود ہے جو اس کام کے لیے موزوں اخلاقی اوصاف رکھتے ہوں، کیونکہ آخرکار جس چیز کو معاشرے کے بگاڑ سے نبرد آزما اور تعمیر صالح کی آزمائشوں سے دوچار ہونا ہے وہ کسی لائحۂ عمل کی دفعات نہیں بلکہ اُن لوگوں کی انفرادی و اجتماعی سیرت ہے جو میدانِ عمل میں کام کرنے کے لیے آگے بڑھیں، اس لیے ہمیں آئندہ کے تعمیری و اصلاحی پروگرام کی تفصیلات پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کام کے لیے کیسے کارکن درکار ہیں، ان کو کن اوصاف سے متصف اور کن برائیوں سے پاک ہونا چاہیے، اور ایسے کارکنوں کی تیاری کے ذرائع کیا ہیں۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد ہم نے اوصافِ مطلوبہ کو تین حصوں میں بیان کیا ہے:-

اولاً، وہ اوصاف جو بنیادی کار کی حیثیت سے اس کام میں حصہ لینے والے ہر فرد کے اندر موجود ہونے چاہییں اور وہ یہ ہیں: (۱) دین کا صحیح فہم (۲) اس پر پختہ ایمان (۳) اس کے مطابق سیرت و کردار (۴) اس کی اقامت کو مقصدِ زندگی بنانا۔

ثانیاً، وہ اوصاف جو اس خدمت کے لیے اٹھنے والی جماعت میں پائے جانے چاہییں، اور وہ یہ ہیں: (۱) باہمی محبت، حسن ظن، اخلاص، ہمدردی و خیر خواہی اور ایک دوسرے کے لیے ایثار۔ (۲) آپس کے مشورے

سے کام کرنا اور مشاورت کے اسلامی آداب کو ملحوظ رکھنا۔ (۳) نظم و ضبط، باضابطگی و باقاعدگی، تعاون اور ٹیم اسپرٹ (۴) تنقید بغرضِ اصلاح، جو سلیقے اور معقول طریقے سے ہو، جس سے جماعت کے اندر رونما ہونے والی خامیوں کا بروقت تدارک ہو سکے نہ کہ خرابیوں میں الٹا اضافہ ہو۔

ثالثاً، وہ اوصاف جو سعیِ اصلاح کو صحیح خطوط پر چلانے اور حقیقی کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے ناگزیر ہیں، یعنی (۱) اللہ کے ساتھ گہرا تعلق اور اسی کی رضا کے لیے کام کرنا۔ (۲) آخرت کی بازپرس کو یاد رکھنا اور اجرِ آخرت کے سوا کسی دوسری چیز پر نگاہ نہ رکھنا۔ (۳) حسنِ اخلاق۔ (۴) صبر۔ (۵) حکمت۔

اب ہمیں یہ دکھانا ہے کہ وہ بڑی بڑی برائیاں کیا ہیں جن سے اس مقصدِ عظیم کے خادموں کو پاک ہونا چاہیے۔

اولین اور بدترین عیب، جو ہر بھلائی کی جڑ کاٹ دیتا ہے، کبر و فخر، غرور، خودپسندی اور تعلّی ہے۔ یہ ایک سراسر شیطانی جذبہ ہے جو شیطانی کاموں کے لیے ہی موزوں ہو سکتا ہے، خیر کا کوئی کام اس کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، بندوں میں بڑائی کا گھمنڈ ایک جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ جو شخص یا گروہ اس جھوٹے پندار میں مبتلا ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ہر تائید سے محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اللہ کو سب سے بڑھ کر یہی چیز اپنی مخلوق میں ناپسند ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مرض کے مریض کو کبھی راہِ راست کی طرف ہدایت نہیں ملتی، وہ پے در پے جہالتوں اور حماقتوں کا ارتکاب کرتا ہے، یہاں تک کہ آخرکار ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ برتاؤ میں اس سے تکبر کا جتنا جتنا اظہار ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ مبغوضِ خلائق ہو کر وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس کا کوئی اخلاقی اثر لوگوں میں قائم ہو سکے۔

خیر کے لیے کام کرنے والوں میں یہ بیماری کئی راہوں سے آتی ہے۔ کم ظرف لوگوں میں یہ اس راہ سے آتی ہے کہ جب اُن کی دینی و اخلاقی حالت گرد و پیش کے معاشرے کی بہ نسبت کسی حد تک بہتر ہو جاتی ہے اور کچھ قابلِ قدر خدمات بھی وہ بجا لاتے ہیں جن کا اعتراف دوسروں کی زبانوں سے ہونے لگتا ہے، تو شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے کہ اب تم واقعی بڑی چیز ہو گئے ہو، اور شیطان ہی کی اکساہٹ سے وہ اپنی بڑائی

اپنی زبان اور اپنے طرزِ عمل سے جتانے پر اتر آتے ہیں۔ اس طرح وہ کام جس کا آغاز نیکی کے لیے نیکی کے جذبے سے ہوا تھا رفتہ رفتہ ایک نہایت غلط راہ پر چل پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ اس کے آنے کا یہ ہے کہ جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ ایک طرف اپنی اور دوسری طرف خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے ہیں ان کے اندر لامحالہ کچھ بھلائیاں پیدا ہوتی ہیں، کسی نہ کسی حد تک وہ اپنے معاشرے کی عام حالت سے ممتاز ہوتے ہیں، کچھ نہ کچھ ان کی خدمات قابل قدر ثابت ہوتی ہیں۔ اور یہ ایسے واقعی امور ہیں جو بہرحال محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ امر واقعی کا احساس بجائے خود فطری اور ناگزیر ہے، مگر نفس کی ایک ذراسی ڈھیل اور شیطان کی ایک ذراسی اکساہٹ اسے تکبر اور خود پسندی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر بسا اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ جب ان کے مخالفین ان کے کام میں، اور کام سے گزر کر ان کی ذات میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو انھیں مجبوراً اپنی مدافعت میں ایسی باتیں کہنی پڑتی ہیں جو چاہے بیانِ واقعہ ہی ہوں مگر اپنے محاسن کے اظہار سے خالی نہیں ہوتیں۔ اس چیز کو ایک ذراسی بے اعتدالی جائز حد سے بڑھا کر تفاخر کے حدود میں پہونچا دیتی ہے۔

یہ ایک خطرناک چیز ہے جس سے ہر اُس شخص اور جماعت کو خبردار رہنا چاہیے جو خلوص کے ساتھ اصلاح کا مقصد لے کر اٹھے۔ ایسے ہر شخص میں فرداً فرداً اور ایسی ہر جماعت میں مجتمعاً عبدیت کا احساس نہ صرف موجود بلکہ زندہ اور تازہ رہنا چاہیے۔ اسے کبھی یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ کبریائی صرف خدا کی ذات کے لیے مخصوص ہے، بندے کا مقام عجز و نیاز کے سوا اور کچھ نہیں۔ کسی بندے میں اگر فی الواقع کوئی بھلائی پیدا ہو تو یہ اللہ کا فضل ہے، فخر کا نہیں شکر کا مقام ہے۔ اس پر اللہ کے حضور اور زیادہ عاجزی پیش کرنی چاہیے اور اس تھوڑی سی پونجی کو خیر کی خدمت میں لگا دینا چاہیے تاکہ اللہ اپنے مزید فضل سے نوازے اور یہ پونجی ترقی کرے۔ بھلائی پا کر غرورِ نفس میں مبتلا ہونا تو دراصل اسے برائی سے بدل لینا ہے اور یہ ترقی کا نہیں بلکہ تنزل کا راستہ ہے۔

احساسِ بندگی کے بعد دوسری چیز جو انسان کو تکبر کے رجحانات سے بچا سکتی ہے وہ محاسبۂ نفس ہے۔ جو شخص اپنا ٹھیک ٹھیک حساب لگائے اور اپنی خوبیوں کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھے کہ وہ کن کمزوریوں اور خامیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہے، وہ کبھی خود پسندی و خود پرستی کے مرض کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اپنے گناہوں

اور قصوروں پر کسی کی نگاہ ہو تو استغفار سے اس کو اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ استکبار کی ہوا اس کے سر میں سما سکے۔

اس غلط رجحان کو روکنے والی ایک اور چیز یہ ہے کہ آدمی صرف اُن پستیوں ہی کی طرف نہ دیکھے جن سے وہ اپنے آپ کو بلند پاتا ہے، بلکہ دین و اخلاق کی اُن بلندیوں کو بھی دیکھے جن کے مقابلے میں ابھی وہ بہت پست ہے۔ اخلاق و روحانیت کی پستیاں بھی لامتناہی ہیں اور بلندیاں بھی لامتناہی۔ بُرے سے بُرا آدمی بھی نیچے کی طرف دیکھے تو کسی کو اپنے سے بدتر پا کر اپنی برتری پر فخر کر سکتا ہے۔ مگر اس فخر کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن ہو کر بہتر بننے کی کوشش چھوڑ دیتا ہے، بلکہ اس سے گزر کر نفس کی شیطنت اسے یہ اطمینان بھی دلاتی ہے کہ کچھ اور زیادہ نیچے اتر جانے کی بھی ابھی گنجائش ہے۔ یہ نقطۂ نظر صرف وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو اپنی ترقی کے دشمن ہوں۔ ترقی کی سچی طلب رکھنے والے ہمیشہ نیچے دیکھنے کے بجائے اوپر دیکھتے ہیں، ہر بلندی پر پہونچ کر مزید بلندیاں ان کے سامنے آتی ہیں جنھیں دیکھ کر فخر کے بجائے اپنی پستی کا احساس ان کے دل میں خلش پیدا کرتا ہے اور یہی خلش انھیں اور زیادہ اوپر چڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جماعت ہر وقت اس معاملے میں چوکنّی رہے اور اپنے دائرے میں کبر و تعلّی اور فخر و غرور کے ہر ظہور کا نوٹس لے کر بروقت اس کا تدارک کرے۔ مگر تدارک کی یہ کوشش کبھی ایسے طریقوں سے نہ ہونی چاہیے کہ لوگوں میں بناوٹی انکسار اور نمائشی تواضع کی بیماری پیدا ہو جائے۔ کبر کی اُس سے بدتر کوئی قسم نہیں ہے جس پر تصنع کے ساتھ عجز و انکسار کا پردہ ڈالا گیا ہو۔

دوسرا بڑا عیب جو خیر کی جڑوں کو کھا جانے میں کبر سے کسی طرح کم نہیں، یہ ہے کہ کوئی شخص اور گروہ بھلائی کا کام نمود و نمائش کے لیے کرے اور اس کام میں اسے خلق کی تحسین حاصل کرنے کی فکر یا اس کی پرواہ ہو۔ یہ چیز صرف خلوص ہی کی نہیں، حقیقت میں ایمان کی بھی ضد ہے اور اسی بنا پر اسے چھپا ہوا شرک قرار دیا گیا ہے۔ خدا اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان صرف خدا کی رضا کے لیے کام کرے، اسی سے اجر کی آس لگائے اور دنیا کے بجائے آخرت کے نتائج پر نگاہ رکھے۔ لیکن ریاکار انسان خلق کی رضا کو مقصود بناتا ہے خلق ہی کے اجر کا طالب ہوتا ہے، اور دنیا ہی میں اپنا اجر نام و نمود، شہرت، ہر دل عزیزی، نفوذ و اثر

اور حشمت و جاہ کی شکل میں پالینا چاہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خلق کو خدا کا شریک یا اس کا مدِّ مقابل بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آدمی خدا کے دین کی خواہ کتنی اور کیسی ہی خدمت کرے، بہرحال وہ نہ خدا کے لیے ہوگی، نہ اس کے دین کی خاطر ہوگی، اور نہ اس کا شمار خدا کے ہاں نیکیوں میں ہوگا۔

صرف یہی نہیں کہ یہ ناپاک جذبہ نتیجہ کے اعتبار سے عمل کو ضائع کر دیتا ہے، بلکہ درحقیقت اس کے ساتھ کوئی صحیح عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس جذبے کی فطری خاصیت یہ ہے کہ آدمی کو کام سے زیادہ کام کے اشتہار کی فکر ہوتی ہے۔ وہ اسی کو کام سمجھتا ہے جس کا ڈھنڈورا دنیا میں پٹے اور تحسین و آفرین کا خراج وصول کر کے لائے۔ جو کام جس کا خدا کے سوا کسی کو پتہ نہ ہو اس کے نزدیک کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس طرح آدمی کے عمل کا دائرہ صرف قابلِ اشتہار اعمال تک محدود ہو جاتا ہے، اور اشتہار کا مقصود حاصل ہو جانے کے بعد خود اُن اعمال کے ساتھ بھی اسے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ آغاز کار میں خواہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ عملی زندگی کی ابتدا کی گئی ہو، یہ بیماری لگتے ہی خلوص اس طرح غائب ہونا شروع ہو جاتا ہے جیسے دق کی بیماری آدمی کی قوتِ حیات کو کھاتی چلی جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ منظر عام سے ہٹ کر بھی نیک رہے، اور اپنا فرض سمجھ کر بھی کوئی فرض بجا لائے۔ وہ ہر چیز کو اس کی نمائشی قدر اور تحسینِ خلق کی قیمت کے لحاظ سے جانچتا ہے۔ ہر معاملے میں صرف یہ دیکھتا ہے کہ دنیا کس روش کو پسند کرتی ہے۔ اور کسی ایسے کام کا تو تصور کرنا بھی اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے جو دنیا میں اسے غیر مقبول بنائے، خواہ ایمان داری کے ساتھ اس کے ضمیر کی آواز یہی ہو کہ وہ ہے کرنے کا کام۔

گوشوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے لیے اس فتنے سے بچنا نسبتاً بہت آسان ہے، مگر جو لوگ پبلک میں آکر اصلاح اور خدمت اور تعمیر کے کام کریں وہ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا رہتے ہیں کہ نہ معلوم کب اس اخلاقی دق کے جراثیم ان کے اندر نفوذ کر جائیں۔ انھیں بہرحال بہت سے وہ کام کرنے ہوتے ہیں جو منظر عام پر آتے ہیں۔ انھیں عوام الناس کو اپنا ہم نوا بنانے اور ان کے اندر اثر حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔ ان کے کام کی بہت سی ضروریات اس بات پر بھی انھیں مجبور کرتی ہیں کہ اپنے کاموں کی رودادیں شائع کریں۔ ان کی کچھ نہ کچھ خدمات ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان کی طرف خلق کا رجوع بڑھاتی اور زبانوں سے ان کے لیے تحسین کے کلمات نکلواتی ہیں۔ انھیں

مخالفتوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہو اور اپنی مدافعت میں بادلِ ناخواستہ ہی سہی، انہیں مجبوراً اپنے اچھے پہلوؤں کو نمایاں کرنا پڑتا ہو۔ اِن حالات میں یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ شہرت ہو مگر شہرت کی چاٹ نہ لگے، نمود اور نمائش ہو مگر نمود و نمائش کی خاطر کام کرنے کی بیماری نہ لگے، مقبولیت ہو مگر وہ مقصود نہ بننے پائے، تحسینِ خلق حاصل ہو مگر اس کے حصول کی فکر یا اس کی پروانہ ہو، ریا کی پیدائش کے اسباب چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں مگر ریا سے دامن بچا رہے۔ اس کے لیے بڑی کاوش، بڑی توجہ اور بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ ایک ذرا سا تساہل بھی اس معاملے میں ریاکاری کے جراثیم کو گھس آنے کا راستہ دے سکتا ہے۔

اس سے بچنے کے لیے انفرادی کوشش بھی ہونی چاہیے اور اجتماعی کوشش بھی۔ انفرادی کوشش کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ ایسے نیک اعمال کا التزام کرے جو زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ ہوں، اور ہمیشہ اپنے نفس کا جائزہ لے کر دیکھتا رہے کہ اسے زیادہ دلچسپی ان مخفی نیکیوں میں محسوس ہوتی ہے یا اُن نیکیوں میں جو منظرِ عام پر آنے والی ہوں۔ اگر دوسری صورت ہو تو آدمی کو فوراً خبردار ہو جانا چاہیے کہ ریا اس کے اندر نفوذ کر رہا ہے اور اللہ سے پناہ مانگتے ہوئے پوری قوتِ ارادی کے ساتھ نفس کی اس کیفیت کو بدلنے کی سعی کرنی چاہیے۔

اجتماعی کوشش کی صورت یہ ہے کہ جماعت اپنے دائرے میں ریاکارانہ رجحانات کو کبھی نہ پنپنے دے، اپنے کاموں میں اعلان و اظہار کو بس حقیقی ضرورت تک محدود رکھے، شوقِ نمائش کا ادنیٰ سا اثر بھی جہاں محسوس ہو اس کا فوراً سدِباب کرے۔ جماعتی مشوروں اور گفتگوؤں میں یہ بات کبھی اشارۃً و کنایۃً بھی برداشت نہ کی جائے کہ فلاں کام اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ مقبولیت کا ذریعہ ہے اور فلاں کام اس لیے نہ کرنا چاہیے کہ اسے لوگ پسند نہیں کرتے۔ جماعت کا داخلی ماحول ایسا ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کی تعریف اور مذمت، ہر دو سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی ذہنیت پیدا کرے اور اُس ذہنیت کی پرورش نہ کرے جو مذمت سے دل شکستہ ہو اور تعریف سے غذا پائے۔ اس کے باوجود اگر کچھ افراد جماعت میں ایسے پائے جائیں جن میں ریا کی بُو محسوس ہو تو ان کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے ان کے علاج کی فکر کی جانی چاہیے۔

تیسرا بنیادی عیب نیت کا کھوٹ ہے جس پر کسی خیر کی عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔ خیر کا کام صرف اس خالص نیت ہی سے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلے اور ہم اس کے لیے سعی کر کے اللہ کے ہاں سرخ رُو ہوں۔ اس نیت کے ساتھ اپنی کوئی ذاتی یا گروہی غرض شامل نہ ہونی چاہیے، اپنا کوئی دنیوی مفاد پیشِ نظر نہ ہونا چاہیے حتیٰ کہ کسی تاویل کے ساتھ بھی اس مقصدِ خیر کے ساتھ اپنے لیے کسی منفعت کی طلب یا امید کی لاگ لگی نہ رہنی چاہیے۔ ایسا ہر کھوٹ نہ صرف یہ کہ اللہ کے ہاں آدمی کے اجر کو ضائع کر دے گا بلکہ دنیا میں بھی اس آلودگی کو لیے ہوئے کوئی صحیح کام نہ ہو سکے گا۔ نیت کی خرابی لامحالہ کردار پر اثر انداز ہوگی، اور کردار کی خرابی کے ساتھ اُس جدوجہد میں کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے جس کا اصل مقصود برائی کو مٹا کر بھلائی کو قائم کرنا ہے۔

یہاں پھر وہی مشکل پیش آتی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ جُزوی بھلائیوں کے لیے کام کرنے کی صورت میں نیت کو اس کھوٹ سے پاک رکھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔ تھوڑا سا تعلق باللہ اور جذبۂ صادق بھی اس کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے پیشِ نظر یہ ہو کہ ایک پورے ملک کے نظامِ زندگی کی اصلاح کی جائے اور اسے بحیثیتِ مجموعی اُن بنیادوں پر استوار کیا جائے جو اسلام نے ہمیں دی ہیں، وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے صرف تعمیرِ افکار، یا صرف تبلیغ و تلقین، یا صرف اصلاحِ اخلاق کی کوششوں پر اکتفا نہیں کر سکتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں لامحالہ ملک کے سیاسی نظام کا رُخ بھی اپنے مقصد کی طرف موڑنے کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اور سیاسی نظام کی تبدیلی لازماً اس بات کو متضمن ہے کہ جو لوگ اس تبدیلی کے لیے کوشاں ہوں، اقتدار یا تو براہِ راست ان کے ہاتھ میں آئے، یا کسی ایسے گروہ کی طرف منتقل ہو جسے ان کی تائید اور پشت پناہی حاصل ہو۔ دونوں صورتوں میں سے خواہ کوئی صورت بھی ہو، اقتدار کا تصور سیاسی نظام کی تبدیلی سے منفک نہیں ہو سکتا۔ اب یہ قعرِ دریا میں رہ کر دامن تر نہ ہونے دینے کا معاملہ ہے کہ ایک جماعت یہ کام کرے اور پورے انہماک کے ساتھ کرے اور پھر بھی اس کے افراد کی انفرادی نیتوں اور پوری جماعت کی مجموعی نیت کو "اپنے لیے اقتدار کی طلب" کا کھوٹ نہ لگنے پائے۔ یہ چیز بڑا مجاہدۂ نفس اور بڑا تزکیۂ قلب و روح چاہتی ہے۔

(باقی صفحہ ۲۱۶ پر)

تزکیۂ نفس

بدعت، اس کے اسباب اور اس کا علاج

از مولانا امین احسن اصلاحی

(سلسلۂ گذشتہ)

بدعت کی تعریف بدعت نام ہے اُس چیز کا کہ جو چیز دین کی نہیں ہے وہ دین میں لا گھسائی جائے۔ کسی چیز کے دین کی چیز ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ قرآن میں بیان ہوئی ہو، اگر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو کسی قابلِ اعتماد حدیث ہی میں آئی ہو، اگر حدیث میں بھی نہ ہو تو کم از کم قیاس و اجتہاد ہی سے یہ ثابت ہو کہ یہ بات قرآن و حدیث سے موافقت اور مناسبت رکھتی ہے۔ اگر اس طرح کا کوئی تعلق بھی اس کا کتاب و سُنت سے ثابت نہ پایا جائے تو پھر وہ بات دین کی بات نہیں ہو سکتی۔ اگر دین کے ساتھ اس کا خواہ مخواہ جوڑ ملانے کی کوشش کی گئی تو یہ بدعت ہے اور اس طرح کی ہر بدعت ضلالت اور گمراہی ہے۔

اس امر کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس طرح کی کوئی بات بدعت اُسی صورت میں قرار پائے گی جب اس کا پیوند دین سے لگانے کی کوشش کی جائے، اگر دین سے اس کا جوڑ نہ ملایا جائے تو اس پر بدعت کا اطلاق نہ ہوگا۔ فرض کیجیے ایک شخص گانا سنتا ہے لیکن وہ اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ یہ چیز دین کا کوئی جزء ہے یا معرفتِ الٰہی کا کوئی ذریعہ ہے تو اس کے اس فعل کو بدعت نہیں کہیں گے کیونکہ اس نے اس چیز کا جوڑ دین سے نہیں ملایا ہے۔ اس کو شریعت کے احکام کی روشنی میں جانچیں گے اور فیصلہ کریں گے کہ اس کا یہ فعل جائز ہے یا ناجائز۔ اور اگر ناجائز ہے تو کس درجہ میں ناجائز ہے۔ لیکن اگر وہی شخص اپنے اسی گانے سننے کے متعلق یہ دعوے کر بیٹھے کہ یہ معرفتِ الٰہی کا کوئی ذریعہ یا تزکیۂ نفس و اصلاحِ باطن کا کوئی نسخہ ہے تو اس سے سوال ہوگا کہ اس نے کتاب و سُنت کی کس دلیل یا ان کے کس اشارہ سے یہ بات اخذ کی ہے اگر وہ کسی نص یا اشارہ کا حوالہ دے گا تو

اس کی روشنی میں اس کا فیصلہ ہوگا اور اگر وہ کوئی حوالہ نہ دے سکے بلکہ محض اپنے وجدان یا ذوق یا تجربہ کو اس کی دلیل ٹھہرائے تو یہ بدعت ہوگی کیونکہ وہ دین کے حرم میں ایک ایسی چیز گھسا رہا ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

یہاں سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے اس میں کوئی اضافہ یا ایجاد یا کوئی نئی راہ نکالنا یا نئی طرح ڈالنا بدعت کے تحت نہیں آتا۔ اس دائرے میں ہم آزاد ہیں کہ جو چاہیں اضافے کریں اور جس طرح کی چاہیں کیاں کر دیں۔ لیکن یہاں معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام میں دین اور دنیا کی اس قسم کی کوئی تفریق ہے بھی؟ اگر ہے تو ان کے درمیان وہ حد فاصل کیا ہے جس سے ایک شخص بغیر کسی اشتباہ کے معلوم کر سکے کہ یہ دین کے حدود ہیں اور یہاں سے دنیا کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

دین اور دنیا کے حدود

اس سوال کے پہلے حصہ کا جواب تو یہ ہے کہ اسلام میں اس معنی میں تو دین اور دنیا کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے جس معنی میں عیسائیت میں ان کے درمیان تفریق ہے کہ شخصی زندگی کے ایک نہایت محدود گوشے کے سوا بقیہ ساری اجتماعی و سیاسی زندگی دین کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ اسلام اس پہلو سے تو ایک کلیت پسند دین ہے کہ اس نے ہماری زندگی کے ہر حصے سے بحث کی ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا سماجی یا سیاسی۔ لیکن اس پہلو سے اس میں بھی دین اور دنیا کی تفریق موجود ہے کہ وہ ہمارے ہر گوشہ زندگی کی ساری تفصیلات و جزئیات سے بحث نہیں کرتا بلکہ صرف ان کے چاروں گوشے متعین کر دیتا ہے۔ ان کو متعین کر دینے کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ ہم جس طرح چاہیں ان کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی رائے اور فکر کی آزادی استعمال کریں اور اپنی قوتِ ایجاد و اختراع کا مظاہرہ کریں۔

اس بات کو چند مثالوں سے سمجھیے:-

ہماری زندگی سے ایک بڑا قریبی تعلق رکھنے والا مسئلہ کھانے پینے کا مسئلہ ہے۔ اس میں اسلام نے دخل تو دیا ہے لیکن اس دخل کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ پہلے ساری کھانے پینے کی چیزوں کی تفصیل سنائی ہو پھر یہ بتایا ہو کہ ان میں سے کیا کیا چیزیں جائز ہیں اور کیا کیا چیزیں ناجائز۔ پھر ان کے پیدا کرنے، ان کے سنبھالنے اور ان کے پکانے اور محفوظ رکھنے کی تدبیریں بتائی ہوں۔ اسلام کو ان تفصیلات سے کوئی بحث نہیں ہے۔

اس نے صرف یہ کیا ہے کہ چند متعین چیزوں کو جو حرام ہیں بتا دیا کہ یہ حرام ہیں ان کو کھانا پینا ناجائز ہے۔ اب جو چیزیں ان کے حکم میں آتی تھیں وہ آپ سے آپ ان کے تحت حرام یا مکروہ ہو گئیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ کی سار ی چیزوں کو انسان کی طلب' اس کے ذوق اور اس کی قوت اکتساب' ایجاد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی طبعی ضرورتوں اور اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرے۔

اسی طرح ہمارے لباس کا مسئلہ ہے۔ اس بارے میں اس نے یہ کیا کہ چند اخلاقی نوعیت کی حدیں مقرر کر دیں۔ مثلاً یہ کہ لباس ساتر ہو' مرد مسرفانہ لباس مثلاً ریشم کا استعمال نہ کریں۔ لباس سے شہدپن اور غنڈہ پن کا اظہار نہ ہو۔ مثلاً تہمد یا شلوار زمین پر گھسٹتی ہوئی یا ٹخنوں سے نیچے نہ ہو۔ عورتیں مردوں کا سا یا مرد عورتوں کا سا لباس نہ پہنیں۔ بس اس طرح کی چند شرطیں عاید کر کے ہمیں آزاد چھوڑ دیا کہ ہم جس طرح کے کپڑے چاہیں ایجاد کریں' جس طرح کے چاہیں سلوائیں' اور جس ڈھب سے انہیں چاہیں پہنیں۔ ان سارے امور کا انحصار ہمارے ملک کی آب و ہوا' ہماری قومی روایات' ہمارے فطری ذوق آرایش اور ہماری قابلیتِ اختراع و ایجاد پر ہے مذہب ان چیزوں میں کوئی دخل نہیں دیتا۔

اسی طرح ہمارا معاشرتی مسئلہ ہے۔ اس میں بھی اسلام نے چند اصول دے دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی بنیاد جائز رشتہ مناکحت پر ہو۔ اس میں مرد کی قوامیت کے ساتھ عورت اور مرد دونوں کے لیے حقوق اور دونوں کے اوپر ذمہ داریاں ہوں' اولاد کی پرورش و تربیت ایک مشترک ذمہ داری ہو' اگر اس رشتہ کو توڑنے کی نوبت آئے تو وہ یونہی واقع نہ ہو جائے بلکہ طلاق' عدت' مہر اور رضاعت کے چند متعین ضوابط کے تحت ہو۔ عورتوں اور مردوں کو آزادانہ اختلاط کی اجازت نہ ہو بلکہ گھروں کے اندر بھی اور گھروں کے باہر بھی چند معلوم حدود کی پابندی کی جائے ان چند اصولی باتوں کے بعد ازدواجی زندگی کو خوش گواری کے ساتھ گذارنا اور اس اجمال پر تفصیل کا رنگ بھرنا میاں اور بیوی کا کام ہے۔ اسلام اندرون خانہ کی روزمرہ زندگی کی جزئیات میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔

اسی طرح ہماری سیاسی زندگی کا معاملہ ہے۔ اس کے متعلق بھی اسلام نے چند بنیادی باتیں طے کر دی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسلام کا نظام حکومت خدا کی حاکمیت کے نظریہ پر مبنی ہو' اس میں قانون کا ماخذ خدا کی شریعت ہو' اس کے چلانے والے تقویٰ اور صلاحیت کے اوصاف سے متصف ہوں۔ جہاں شریعتِ الٰہی کی کوئی واضح ہدایت

موجود نہ ہو وہاں سارے معاملات شوریٰ کے ذریعہ سے طے کیے جائیں۔ یہ اور اسی طرح کے چند بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک سیاسی نظام کو بنانا اور چلانا اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق اس کو ڈھالنا اور ترقی دینا ہمارا اپنا کام ہے۔ اسلام ان تفصیلات میں نہیں پڑتا جو بالکل انتظامی نوعیت کی ہیں اور جن کا شعور ہر معاشرے کی فطرت کے اندر ودیعت ہے۔

یہ چند چیزیں محض بطور مثال ذکر کی گئی ہیں۔ ہمارا مقصود یہاں نہ تو تمام شعبہ ہائے زندگی کا استقصاء کرنا ہے اور نہ ان اصولوں کی تفصیل کرنا ہے جو ان شعبہ ہائے زندگی سے متعلق اسلام نے دیے ہیں۔ یہ چیزیں ہر صاحب علم قرآن اور حدیث سے اخذ کر سکتا ہے۔ ہم تو یہاں صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام اگر ایک کلیت پسند دین ہے تو وہ کس معنی میں کلیت پسند ہے۔ وہ کلیت پسند تو بے شک ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اس کلیت پسندی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی سے متعلق وہ بنیادیں متعین کر دیتا ہے جن پر اس کو مبنی ہونا چاہیے۔ یہ معنی اس کلیت پسندی کے نہیں ہیں کہ وہ اس شعبۂ زندگی سے متعلق ساری جزئیات و تفصیلات بھی بتاتا ہو۔ یہی حقیقت ہے جس کو ہمارے فقہاء اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ اصل ہر چیز میں اباحت ہے۔ یعنی ہر شعبۂ زندگی کے اندر اسلام کچھ حدود متعین کر دیتا ہے اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ ان حدود کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے فکر و عمل کی وہ صلاحیتیں استعمال کریں جو ہمارے اندر ودیعت ہیں۔

حدبندی اور اباحت، پابندی اور آزادی کا یہی وہ امتزاج ہے جو اسلام کو نہ صرف دوسرے مذاہب پر فوقیت بخشتا ہے بلکہ اس کو ایک ابدی دین کا مقام عطا کرتا ہے۔ ہمارے ہر شعبۂ زندگی کو چند پابندیوں کے ساتھ یہ جو باندھ دیا گیا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ خواہ اس پر کتنے ہی تغیرات اور حوادث طاری ہوں لیکن وہ ان حقایق سے منحرف نہ ہونے پائے جو فطرت کے اٹل حقایق ہیں۔ یہ حقایق اگر قایم ہیں تو زندگی کا ہر تغیر اسلام ہی کے تحت ہے۔ اس تغیر سے معاشرہ یا تمدن یا سیاست میں کسی فساد کے پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ حقایق اپنی جگہ پر قایم نہ رہ سکیں تو پھر ہماری زندگی اس جہاز کے مانند ہے جس کا لنگر ٹوٹ چکا ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چٹان سے جا ٹکرائے۔ اور یہ جو ایک وسیع دایرہ آزادی کا رکھا گیا ہے جس کے اندر ہم خود اپنی فکری و عملی صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں تو یہی وہ چیز ہے جو اسلام کے اندر وہ لچک پیدا کرتی

ہے جس کی وجہ سے وہ زمانہ کے ہر اس صالح تغیر کو اپنا لیتا ہے جو اس کے بنیادی اصولوں سے بے جوڑ نہیں ہوتا یہ چیز نہ آپ موسائیٹ میں پائیں گے اور نہ مسیحیت میں اور نہ دنیا کے کسی اور دھرم یا مذہب میں۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام ایک طرف تو ہماری ساری زندگی پر حاوی بھی ہے اور دوسری طرف اس میں دین اور دنیا کے الگ الگ دایرے بھی ہیں۔ ان میں سے ایک دایرہ کے اندر ہم پابند ہیں اور دوسرے دایرہ کے اندر ہم آزاد۔

یہی دایرہ جس کے اندر ہم آزاد ہیں قرآن کے بعض مقامات اور متعدد احادیث میں دنیا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دنیا کا لفظ عام طور پر تو آخرت کے مقابل میں آتا ہے اور اس وقت اس سے عالم باقی کے مقابل میں یہ عالم فانی مراد ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب اس خاص مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو یہ لفظ دین کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس سے مراد ہماری زندگی کا وہ دایرہ ہوا کرتا ہے جس کی چاروں حدیں متعین کر دینے کے بعد ہمیں اس میں آزادی بخشی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (۱۵، لقمان)	اور اگر تمہارے والدین اس بات کے درپے ہوں کہ تم کسی ایسے کو میرا شریک بناؤ جس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو تم ان کی بات نہ مانیو لیکن دنیوی معاشرت کے دایرہ میں ان کے ساتھ دستور کے مطابق سلوک کرتے رہنا۔

اس آیت میں فی الدنیا کا لفظ دین کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد ہماری معاشرتی زندگی کا وہ دایرہ ہے جس کے اندر خدا نے ہمیں آزاد چھوڑا ہے، کسی حکم یا ممانعت کے ذریعہ سے ہماری آزادی پر کوئی پابندی عاید نہیں کر دی ہے۔ اس دایرہ میں ہمیں ہدایت ہے کہ ہم والدین کے ہر حکم کی اطاعت کریں کیونکہ یہاں ان کی اطاعت اور خدا کی اطاعت میں کسی تصادم کا اندیشہ نہیں ہے۔ تابیر نخل والی مشہور حدیث میں حضورؐ نے یہ جو ارشاد فرمایا:۔

انتم اعلم بامور دنیاکم	تم اپنی دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔

اس سے ہماری زندگی کا یہی دایرہ مراد ہے۔

اب مذکورہ بالا سوال کے دوسرے حصہ پر آیئے۔ یعنی اس **سوال** پر کہ ہمارے دین اور ہماری دنیا کے درمیان وہ حدفاصل کیا ہے جو ان دونوں دایروں کو اس طرح ایک دوسرے سے نمایاں اور ممتاز کر دے کہ دونوں میں کوئی التباس اور اشتباہ باقی نہ رہ جائے تاکہ ہم اپنے اختیار اور اپنی آزادی کے استعمال میں حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے مجرم نہ ٹھیریں بلکہ ٹھیک ٹھیک اسی دایرہ کے اندر اپنی آزادی استعمال کریں جس دایرہ کے اندر ہمیں اس کے استعمال کا حق ملا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دنیا سے مراد وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں ہمیں خدا اور رسول کی طرف سے نفی یا اثبات کی صورت میں کوئی ہدایت نہ دی گئی ہو۔ اور دین سے مراد وہ امور و مسایل ہیں جن میں خدا اور رسول کی جانب سے نفی یا اثبات کی صورت میں کوئی ہدایت دی گئی ہو۔ یہ ہدایت خواہ قرآن کے ذریعے سے دی گئی ہو یا حدیث کے ذریعے سے یا قرآن و حدیث کے کسی اشارے یا کسی اجتہاد و استنباط سے نکلتی ہو۔ جس طرح کی بھی ہدایت ہو وہ جس امر سے متعلق موجود ہو وہ دین کا دایرہ ہے، اس میں ہمارے فکر و عمل کی آزادی بس اس حد تک ہے کہ ہم اچھی طرح جانچ پرکھ کر یہ دیکھ لیں کہ جو نص ہے وہ اپنے مفہوم و مدعا میں واضح ہے یا نہیں؟ جو حدیث ہے وہ ثابت ہے یا نہیں؟ اور جو استنباط یا اجتہاد پیش کیا گیا ہے وہ اپنی کوئی اساس رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ان پہلوؤں سے اس میں کوئی ضعف نہیں ہے تو اس سے انحراف دین سے انحراف ہے۔

بدعت کا دایرہ یہی دایرہ ہے جس میں بغیر کسی شرعی دلیل کے محض اپنے جی سے کوئی اضافہ کر دینا اسلام کی اصطلاح میں بدعت ہے اور اس بدعت کو اسلام نے گمراہی اور ضلالت قرار دیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ:۔

اما بعد، فان خیر الحدیث	یاد رکھو کہ بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین
کتاب اللہ وخیر الہدی ھدی	ہدایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے۔ اور بدترین
محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشر	چیزیں وہ بے جوڑ اضافے ہیں جو ان میں کر دیے جائیں

الامور محدثاتها وكل بدعة ضلالة — اس طرح کی ہر چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے

(ریاض الصالحین بحوالہ مسلم)

ایک دوسری حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یوں مروی ہے :۔

قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من احدث فى امرنا هذا ماليس منه فهو رد (متفق علیہ) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی چیز گھسائی جو اس میں کی نہیں ہے تو وہ شے مردود ہے۔

یہی بات مسلم شریف میں بایں الفاظ وارد ہوئی ہے :۔

من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو رد — جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کی تائید میں ہمارے دین کی کوئی دلیل نہیں ہے تو وہ بات مردود ہے۔

عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

واياكم ومحدثات الامور فان كل بدعة ضلالة (ترمذی، ابوداود) — اور بدعت کی باتوں سے بچو کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ابغض الناس الى الله ثلاث - ملحد فى الحرم ومتبغ فى الاسلام سنة الجاهلية ومطلب دم امرئ مسلم بغير حق ليهريق دمه

(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین قسم کے آدمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ غضب کے مستحق ہیں۔ ایک وہ شخص جو عین حرم میں کسی بے دینی کا ارتکاب کرے، دوسرا وہ شخص جو اسلام کے اندر جاہلی طریقہ گھسانے کی کوشش کرے، تیسرا وہ شخص جو ناحق کسی مسلمان کی جان کے درپے ہو تاکہ اس کا خون بہائے۔

بلال بن حارث مزنی رضؓ سے روایت ہے کہ:۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے

من احیا سنۃ من سنتی قد امیتت	میری سنتوں میں سے کوئی ایسی سُنت زندہ کی جو ختم
فان لہ من الاجر مثل اجور من عمل	کر دی گئی تھی تو اس کو ان لوگوں کے برابر برابر اجر ملے گا
بھا من غیر ان ینقص من اجورھم	جو اس پر عمل کریں گے' بغیر اس کے کہ ان عمل کرنے
شیئًا ومن ابتدع بدعۃ ضلالۃ	والوں کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو۔ اور جس نے کوئی ایسی
لا یرضاھا اللہ ورسولہ فکان علیہ	بدعت ضلالت ایجاد کی جو اللہ اور رسول کو پسند نہیں ہے
من الاثم مثل اٰثام من عمل بھا	تو اس کو اس پر عمل کرنے والوں کے برابر برابر گناہ ہوگا
لا ینقص ذلک من اوزارھم شیئًا	اور اس سے عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں
(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)	ہوگی۔

دین کے دایرہ کے اندر اس نوع کی کسی مداخلت کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو بات دین کی ہے وہ تو نکال باہر کی جائے اور اس کی جگہ یہ نو ایجاد چیز لے لے جس کے لیے دین میں کوئی سند نہیں ہے۔ اس وجہ سے ایک بدعت کرنے والے کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے ہاتھ کا گُہر پھینک کر اس کے بجائے کوئی مینگنی اٹھالے یا اپنے ہاتھ کی مچھلی چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی سانپ پکڑ لے۔ اس حقیقت کی طرف ایک حدیث میں حضورؐ نے یوں اشارہ فرمایا ہے:۔

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع	جس قوم نے کوئی بدعت ایجاد کی تو اسی کے مانند
مثلھا من السنۃ فتمسکٌ بسنۃ	ان کے اندر سے ایک سُنت اٹھالی گئی تو ایک سنت کو
خیر من احداث بدعۃ	تھامے رکھنا ایک بدعت ایجاد کر لینے سے کہیں بہتر
(مشکوٰۃ بحوالہ احمد)	ہے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بدعت دین کی تخریب کا دوسرا نام ہے۔ جو شخص ایک بدعت قائم کرتا ہے وہ گویا ایک سنت کو ڈھا دیتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام میں جس طرح بدعت کو ضلالت قرار دیا گیا ہے اسی طرح کسی صاحب بدعت کے ساتھ احترام اور محبت کے تعلق کو ہدم اسلام سے تعاون سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:۔

من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)

جس نے کسی صاحبِ بدعت کی عزت کی تو گویا اس نے اسلام کے ڈھانے میں تعاون کیا۔

اس تفصیل سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بدعت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ ہماری زندگی کے کس دایرہ کے اندر ظہور کرتی ہے؟ شریعت میں یہ کس درجہ کا جرم ہے؟ اور یہ کس طرح علم حق کے آثار اور اس کی نشانیوں کو مٹانے والی ہے۔ اب آگے ہم اس کے اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔

بدعت کے دو بڑے سبب ہمارے نزدیک بدعت کے بڑے سبب دو ہیں۔ ایک غلو پسندی اور دوسرے خواہشاتِ نفس کے لیے شرعی جواز پیدا کرنے کی خواہش۔ اب ہم ان دونوں اسباب کی کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کرتے ہیں:۔

غلو پسندی انسان کے اندر یہ ایک عام کمزوری پائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کے ساتھ اس کا تعلق محض عقلی ہی نہیں بلکہ جذباتی بھی ہوتا ہے ان کے معاملے میں وہ بسا اوقات غیر متوازن اور غیر معتدل ہو جایا کرتا ہے۔ آدمی اپنی بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے تو صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات اس محبت میں ایسا اندھا ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ عداوت بھی کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اس اندھے پن میں اس کو خدا کے حقوق کا بھی کچھ ہوش نہیں رہ جاتا ہے۔ اگر اسے اپنے قبیلہ یا قوم یا ملک سے محبت ہے تو ان کی عصبیت اس پر بسا اوقات اتنی غالب آجاتی ہے کہ وہ ان کے لیے پوری انسانیت کا دشمن بن جاتا ہے، حد یہ ہے کہ ان کی حمایت میں خود خدا سے بھی لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہی چیز مذہب کے دایرہ میں آکر اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ مذہب کے ساتھ اولاً تو عام لوگوں کا تعلق عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہوتا ہے اور اگر عقلی ہوتا بھی ہے تو بھی اس معاملے میں انسان کے جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عقل کے لیے ان کو ضبط میں رکھنا آسان کام نہیں ہوتا۔ یہ جام و سنداں کی بازی کھیلنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ چنانچہ اس دایرہ کے اندر ایسا بہت ہوتا ہے کہ آدمی کو جس حد پر رک جانا چاہیے وہاں آکر وہ نہیں رکتا، بلکہ اس حد کو لانگ کر آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ اگر ایک شخص اس کا مرشد ہے تو وہ اس کو مرشدی کے درجہ پر نہیں رکھے گا بلکہ اس کی خواہش یہ ہو گی کہ وہ کسی طرح اس کو رسالت کے مرتبہ پر فایز کر دے۔ اسی طرح اگر ایک ذات کو خدا نے منصبِ رسالت سے سرفراز فرمایا ہے تو یہ اپنے جوشِ عقیدت میں

یہ چاہے گا کہ اس کو خدا کی صفات میں بھی کچھ نہ کچھ شریک کر دے۔ اگر اس سے کسی کام کا مطالبہ پاؤ سیر کیا گیا ہو تو وہ چاہے گا کہ اس کو بڑھا کر سیر بھر کر دے۔ اس غلو پسندی نے دنیا میں بڑی بڑی بدعتوں کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ اسی کے سبب سے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا۔ اسی کے سبب سے انہوں نے اپنے صوفیوں اور عالموں کو ارباباً من دون اللہ کا درجہ دیا اور یہی چیز تھی جس نے ان کو رہبانیت کے فتنہ میں مبتلا کیا۔ چنانچہ قرآن نے ان کی اس غلو پسندی پر کئی جگہ ان کو ملامت کی ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۘ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (النساء: ۱۷۱)

اے اہل کتاب اپنے دین کے معاملے میں غلو نہ کرو اور اللہ پر کوئی ایسی بات نہ لگاؤ جو حق نہ ہو۔ مسیح عیسیٰ بن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کے ایک کلمہ ہیں۔ اس کلمہ کو اس نے مریم کے اندر ڈالا اور اس کی طرف سے ایک روح ہیں، تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ اس سے باز آؤ، یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے، وہ اس عیب سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو۔ اسی کے قبضے میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کافی ہے بھروسہ کے لیے۔

اللہ کی رضا جوئی ہر دین میں بحیثیت اصلی نصب العین کے پیش نظر رہی ہے اور اس نصب العین تک پہونچنے کے لیے ہر مذہب نے ایک معتدل اور متوازن پروگرام جو قوم کے مناسب حال ہو، خود تجویز کر دیا ہے۔ یہ پروگرام نصاریٰ کے پاس بھی موجود تھا اور وہ اس پر کاربند ہو کر اس نصب العین کو حاصل کر سکتے تھے لیکن ان کے علماء اور صوفیا، اتنے ہی پر قانع نہیں ہوئے جتنا حضرت مسیح علیہ السلام ان کو بتا گئے تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی حد اس سے آگے بڑھ کر قایم کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں انہوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ قرآن نے ان کی اس بدعت کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:-

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا

(۲۷، حدید)

اور رہبانیت جس کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی۔ ہم نے یہ چیز ان کے اوپر فرض نہیں کی۔ ان کے اوپر جو چیز فرض کی گئی وہ تو صرف خدا کی رضا جوئی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کے حدود کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھا (اور رہبانیت میں مبتلا ہو گئے)

مسلمانوں کو اس غلو پسندی کی بیماری سے بچانے کے لیے ایک طرف تو نصاریٰ کی تاریخ سنائی گئی کہ وہ کس طرح اس بیماری کے سبب سے بدعتوں میں مبتلا ہوئے اور پھر اس کے نتیجے میں دین حق کی نعمت سے محروم ہوئے۔ دوسری طرف قرآن و حدیث دونوں میں ان کو افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صحیح نقطۂ اعتدال پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں:۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین جماعتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے پاس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال پوچھنے آئیں۔ جب ان کو آپ کی عبادت کا حال بتایا گیا تو انہوں نے اس کو اپنے گمان اور توقع سے بہت کم پایا۔ وہ بولے کہ ہمارا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ؟ آپ کے تو تمام اگلے اور پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب بولے میں تو رات رات بھر نماز ہی پڑھا کروں گا۔ دوسرے صاحب نے کہا میں برابر روزے رکھا کروں گا کبھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے صاحب نے فرمایا کہ میں عورتوں سے [illegible] کبھی شادی نہ کروں گا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ آپ نے فرمایا تمہی لوگ تھے جو یہ باتیں کر رہے تھے؟ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کے حدود کا پاس کرنے والا ہوں لیکن روزے بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور شادی بیاہ بھی کرتا ہوں۔ تو جس نے میرے طریقے سے انحراف اختیار کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔" (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم و بخاری)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً بعض کام کیے پھر آپ نے ان کے بارے میں لوگوں کو رخصت دیدی۔ کچھ لوگوں نے اس رخصت سے فائدہ

اٹھانا کچھ اچھا نہیں سمجھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہونچی تو آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا: بعض لوگوں کو یہ کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسی چیزوں کے کرنے سے احتراز کرتے ہیں جو میں خود کرتا ہوں؟ خدا کی قسم میں ان سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور ان سے زیادہ اس کا ڈر رکھتا ہوں"

(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ دین کے معاملے میں اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ بھی تم پر سختی کرے۔ ایک گروہ نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی، یہ انھی کے بقایا ہیں جن کو تم گرجوں اور خانقاہوں میں دیکھ رہے ہو۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا الآیۃ (مشکوٰۃ بحوالہ ابو داؤد)

اس آخری حدیث کے یہ الفاظ کہ "تم دین کے معاملے میں سختی نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی کرے" ایک نہایت اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کو نیکی اور تقویٰ کے انھی پیمانوں سے ناپنا چاہتا ہے جو اس نے خود مقرر کر دیے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ان پیمانوں کو حقیر ٹھہرا دے اور خود اپنی ایجاد سے کچھ نئے پیمانے بنائے جو اس کے زعم میں خدا کے پیمانوں سے بڑے ہوں تو پھر خدا بھی اس کو ان ہی پیمانوں سے ناپے گا اور اگر وہ خود اپنے ہی مقرر کیے ہوئے پیمانوں پر پورا نہیں اترے گا تو پھر بغیر کسی رعایت کے اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہوگا اگر کسی شخص نے زہد، توکل، صبر، رضا اور محبت وغیرہ کے ایسے معیارات بنائے ہیں جو خدا اور رسول کے مقرر کیے ہوئے معیارات سے اونچے ہیں تو وہ انھی معیارات سے جانچا جائے گا اور اگر ان پر پورا نہ اترے گا تو کھوٹا قرار پائے گا۔ یہ مطلب ہے اس بات کا کہ "انھوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔"

لیکن ان نہایت واضح تاکیدات و تنبیہات کے باوجود مسلمانوں کے اندر بھی غلو پسندی کی یہ بیماری پھیلی اور اس سے ہمارے فکر و عمل کے ہر گوشے میں مختلف قسم کی بدعتیں داخل ہو گئیں۔ اس سے عقاید بھی متاثر ہوئے، احکام و قوانین بھی متاثر ہوئے اور عبادات و اخلاق بھی اس کی زد میں آئے۔

عقاید و نظریات میں یہ فتنہ بیشتر علم کلام کی راہ سے گھسا اور عبادات و اخلاق میں زیادہ تر تصوف

کی راہ سے۔ اس طرح کی ساری چیزوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ ہم صرف مثال کے طور پر اشاعرہ کے جبر، معتزلہ کے نظریۂ اختیار، معطّلہ اور مجسّمہ کے نظریات تعطیل و تجسیم اور حضرات صوفیہ کے نظریۂ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ نجات کے معاملے میں خوارج کی تنگ گیری اور مرجیہ کی بے قیدی اور اباحت بھی اسی ذیل میں شمار کیے جانے کے لیے لائق ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو خلقِ قرآن کے جس فتنہ کے سبب سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اسی طرح فقہ میں بعض خود ساختہ اصولوں کو اساس بنا کر تخریج در تخریج کا جو سلسلہ شروع ہوا اور خیالی صورتیں فرض کر کر کے جو مسایل پیدا کیے گئے اس کے سبب سے ہماری فقہ میں ہر باب کے تحت ایسی بے شمار جزئیات داخل ہو گئیں جو زندگی کو بالکل تنگ کر دینے والی اور آدمی کے فکر و عمل کی آزادی کو بالکل سلب کر لینے والی ہیں۔ جو باتیں شریعت نے ہر آدمی کی سمجھ بوجھ پر چھوڑ دی تھیں اور جن میں وہ اپنی عقل سے کام لے کر ان کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی اختیار کر سکتا تھا ان کی ایک خاص شکل متعین کر دی گئی اور اس کو اس درجہ اہمیت دے دی گئی کہ اس سے معمولی انحراف خود دین سے انحراف سمجھا جانے لگا۔

اس غلو پسندی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ان مسائل میں ہوا ہے جو مختلف فقہی مذاہب میں کسی سبب سے مابہ النزاع بن گئے ہیں۔ یہ مسائل ہیں تو عموماً بالکل جزوی اور فروعی نوعیت کے لیکن ہر مسلک کی کتابوں میں انہی شد و مد سے ان پر بحثیں ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اصلی مسائل یہی ہیں اور انسان کی نجات کا تمام تر انحصار انہی کے اختیار کرنے یا نہ کرنے پر ہے۔ یہ بحثیں ہر مسلک کے حامیوں کی طرف سے تصنیفات و تالیفات میں بھی پورے زور و قوت کے ساتھ اٹھائی گئی ہیں اور انہی پر ایک ایک مسجد اور ایک ایک مدرسہ میں آئے دن مناظرہ کی مجلسیں بھی گرم ہوتی رہتی ہیں بلکہ بسا اوقات ان کے سبب سے مسلمانوں کے اندر جنگ و جدل، تکفیر و تفسیق، گرفتاری و مقدمہ بازی اور قتل و آتش زنی تک نوبتیں پہونچتی ہیں۔

عبادات و اخلاق میں غلو کے سبب سے زیادہ تر بدعتیں تصوف کی راہ سے آئی ہیں۔ صوفیہ نے تزکیۂ نفس، تقربِ الٰہی اور ذکر و عبادت کی بعض ایسی صورتیں ایجاد کی ہیں جن کا کتاب و سنت میں کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ پُر مشقت ریاضتیں، چلہ کشی اور عملیات کی ان کے ہاں ایسی مثالیں موجود ہیں جن کا دین میں بہتر ہونا تو درکنار

ان کا جواز بھی مشکل سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور ان میں سے بعض کے بدعت ہونے میں تو کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں میں نے ایک مرتبہ خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ ذات رسالت کے ساتھ عقیدت و محبت کے اظہار کا ایک بڑا ذریعہ ان میں سے بہتوں کے ۔ں صرف قوالی ہے اور اس میں بے دھڑک ایسے اشعار گائے جاتے ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ العیاذ باللہ خود اللہ تعالیٰ سے بڑھا دیا جاتا ہے۔

ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ اس طرح کی چیزیں صرف بدعت پسند صوفیوں ہی کے ہاں پائی جاتی ہیں، جو صوفیہ کتاب و سنت پر عامل ہیں ان کے ہاں اس طرح کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہ خیال اگر حقیقت کے مطابق ثابت ہو جائے تو مجھے اس کی بہت خوشی ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تصوف کا جو حصہ پاکیزہ ہے بعض چیزیں اس میں بھی ایسی ملتی ہیں جن کے بدعت ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ تصور شیخ کو محبت الٰہی کا ایک زینہ سمجھا جاتا ہے اور ہمارے صوفیانہ لٹریچر میں اس کی جو توجیہ عموماً کی گئی ہے اس کی روشنی میں یہ کتاب و سنت کے صریح خلاف نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے قائل بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے لائق احترام ہونے سے کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔

صوفیانہ لٹریچر میں اس غلو کا سب سے زیادہ مظاہرہ اس حصے میں ہوا ہے جہاں یہ حضرات صبر، شکر، زہد، قناعت، توکل، انابت، عبودیت، خشیت اور محبت و رضا وغیرہ کی حقیقتیں بیان کرتے ہیں۔ یہ بحثیں آپ تصوف کی کسی قابلِ اعتماد کتاب میں پڑھیے۔ میں اس کے لیے رسالہ قشیریہ، یا قوت القلوب یا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء العلوم کے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ یہ کتابیں صوفیانہ لٹریچر میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اصلاح نفس کے نقطۂ نظر سے ان کتابوں کو پڑھنا اور بار بار پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ ان کتابوں میں جب آدمی ان مباحث کو پڑھتا ہے تو پہلی نظر میں ان کی دلکشی آدمی کو مسحور کر لیتی ہے لیکن جب آدمی ان کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہے اور یہ چیز بھی اس کے پیش نظر ہوتی ہے کہ ان کو عملی زندگی میں اپنانا بھی ہے تو پھر وہ اکثر جگہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ باتیں بڑی ہی اعلیٰ، بڑی ہی پاکیزہ اور بڑی ہی نادرہ ہیں لیکن ان کو اپنانا صرف ان بزرگوں ہی کا کام تھا جنہوں نے یہ لکھی ہیں یا جو گزر چکے ہیں۔ اس زمانے کے انسان کا یہ ظرف

نہیں ہے کہ وہ ان مقامات تک پہونچ سکے بلکہ بعض اوقات وہ یہ رائے قایم کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے بشری تقاضوں سے دست کش ہوئے بغیر شاید ان کو اپنا ہی نہیں سکتا۔ علامہ ابن قیمؒ نے مدارج السالکین میں سلوک کے مقامات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور جگہ جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فلاں چیز کی حقیقت یہ ہے جو ارباب تصوف پیش کرتے ہیں تو پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اس مقام کو صحابہ بلکہ انبیاء بھی حاصل نہ کر سکے۔

ابن قیمؒ کی مدارج السالکین، جیسا کہ میں اوپر کہیں عرض کر چکا ہوں، ایک مشہور صوفی شیخ ابو اسمٰعیل ہروی کی کتاب منازل السایرین کی شرح اور اس پر ایک قسم کا تبصرہ ہے۔ شیخ ابو اسمٰعیل نے توبہ، توکل، صبر، رضا وغیرہ کی شرح میں یہ طریق اختیار کیا ہے کہ ہر چیز کے وہ تین درجے بیان کرتے ہیں۔ (ہم اس کی بعض مثالیں اس کتاب کی پچھلی فصلوں میں نقل کر آئے ہیں) پہلا درجہ عوام کا، دوسرا درجہ خواص کا، تیسرا درجہ اخص الخواص یا بالفاظِ دیگر کاملین و عارفین کا۔ عموماً ...... پہلے درجے ہی کا معیار وہ ایسا بلند قایم کرتے ہیں کہ آدمی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ قرآن آدمی کو جہاں تک لے جانا چاہتا ہے وہ تو بس یہیں تک ہے اور اگر اس میں کسی پہلو سے کوئی کسر ہے تو دوسرے میں تو وہ بہرحال پوری ہو جاتی ہے۔ رہا تیسرا درجہ تو وہ صاف ایک مافوق بشریت درجہ معلوم ہوتا ہے جو شیخ کے نزدیک تو کاملین کا درجہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص کتاب و سنت کو معیارِ کامل مان کر اس کا تجزیہ کرے تو عموماً اس کے متعلق وہ یہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس درجے یا اس مقام کا اگر کوئی وجود ہے تو وہ صرف شیخ کے ذہن میں ہے۔ نہ کتاب و سنت میں اس کا کوئی اشارہ ملتا ہے اور نہ عقل اور قیاس کی وہ گرفت میں آتا ہے۔ یہ صورت حال آدمی کو سخت حیرانی میں ڈال دیتی ہے۔ اگر وہ یہ مانے کہ یہ ایک مقام ہے تو سہی لیکن کتاب و سنت میں اس کا بیان اس وجہ سے نہیں ہوا ہے کہ وہ صرف متوسط درجہ کے لوگوں ہی کی تعلیم کے لیے ہیں، جیسا کہ صوفیہ کے ایک گروہ کا خیال ہے، تو اس پر کسی ایسے شخص کا دل مطمئن نہیں ہوتا جو کتاب و سنت اور انبیائے کرام ہی کو معیارِ کامل مانتا ہے۔ اگر وہ خیال کرے کہ اس درجہ کا بیان تو کتاب و سنت میں ہوا ہے لیکن "لکل ظہر بطن" کے صوفیانہ نظریہ کے مطابق یہ حقایق کتاب و سنت کے پردوں میں اس طرح چھپے ہوئے ہیں کہ ان تک صرف خاص خاص لوگ ہی پہونچ سکے ہیں، قرآن کے الفاظ سے ان تک رسائی نہیں حاصل کی جا سکتی تو اس سے بھی دل کو اطمینان نہیں ملتا کیونکہ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نظریہ اور باطنیت کے

درمیان فرق کیا ہے؟ اگر وہ یہ فرض کرے کہ یہ معیارات بتائے اور سکھائے ہوئے تو انبیائے کرام ہی کے ہیں لیکن امت میں ان کے منتقل ہونے اور پھیلنے کے ذریعے سفینے نہیں بلکہ خواص کے سینے ہیں تو یہ چیز اور بھی متوحش کرتی ہے کیونکہ یہ چیز پورے نظام دین ہی کو ڈھا دیتی ہے۔ اگر وہ مانے کہ ان کے معلوم کرنے کا ذریعہ وحی نہیں بلکہ کشف ہے تو اس سے اور بھی الجھن بڑھتی ہے کیونکہ کسی کشف کو وحی کی کسوٹی پر جانچے بغیر بجائے خود سند مان لینا اسی شخص کے لیے ممکن ہے جو اپنے دین و ایمان کے معاملے میں اتنا بے پروا ہو کہ وہ ان کو ہر خواب اور ہر وسوسہ پر قربان کر سکتا ہو۔

اگر ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں مانی جاسکتی تو آخر اس کے سوا کیا چارہ کار ہے کہ آدمی یہ مانے کہ جس مقام کی تشریح و توضیح میں کتاب و سنت کے قائم کردہ معیار سے تجاوز کیا گیا ہے یہ محض غلو کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ علامہ ابن قیمؒ نے تنقید کر کے دکھایا ہے کہ شیخ ابو اسمٰعیل کے قائم کردہ معیارات کتاب و سنت کے معیارات سے اونچے ہیں اور چونکہ صحیح انسانی فطرت کے مطابق معیارات وہی ہو سکتے ہیں جو کتاب و سنت میں قائم کیے گئے ہیں اس وجہ سے لازماً یہ معیارات غلط ہیں۔ اس غلو کے سبب سے صوفیائے کرام کے ان معیارات سے یا تو آدمی پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے اور وہ ان کو اپنانے کی ہمت ہی نہیں کرتا یا اگر کرتا ہے تو علمی پہلو سے وہ تفلسف اور باطنیت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور عملی پہلو سے جوگ اور رہبانیت کا۔ علم و معرفت کی بحث میں میں ابو اسمٰعیل ہروی کی کتاب سے چند اقتباسات اوپر پیش کر آیا ہوں۔ وہ میرے خیال کی تائید کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ یہ تو تصوف کے صرف ایک خاص اسکول کی ترجمانی ہوئی، دوسرے صوفیاء کرام کا طرز فکر اس سے مختلف ہے تو میری جانب سے اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ جن صوفیائے کرام کا طرز فکر اس سے مختلف ہے، جو کتاب و سنت ہی کو معیار کامل مانتے ہیں مجھے ان پر اعتراض نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ کوئی ایسی کتاب منتخب کیجیے جس میں ہر مکتب خیال کے صوفیوں کی ترجمانی کی گئی ہو اور اس کو اس نقطۂ نظر سے پڑھیے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے پھر دیکھیے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔ میرے خیال میں اس مقصد کے لیے رسالۂ قشیریہ ایک موزوں کتاب ہے۔ اس میں ہر باب کے تحت تقریباً اکثر اکابر تصوف کے اقوال و افکار موجود ہیں۔ اس کو تنقید کے ساتھ پڑھیے تو اس میں بھی قدم قدم پر وہ

بے اعتدالی موجود ملے گی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ میں اس کتاب سے بعض مثالیں پیش کرکے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر واضح کرسکتا ہوں لیکن چونکہ آگے یہ ساری بحثیں تزکیہ عمل اور تزکیہ تعلقات و معاملات کے ابواب میں تفصیل کے ساتھ آرہی ہیں اس وجہ سے یہاں بیچ راستہ میں میں ناظرین کو روکنا نہیں چاہتا۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی بدعت کا دوسرا سبب خواہشاتِ نفس کی پیروی ہے۔ انسان کے اندر یہ بڑی کمزوری ہے کہ بسا اوقات وہ ایک نظریہ یا ایک رویہ اختیار تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اس کی خواہشاتِ نفس کے مطابق ہوتا ہے، اس سے اس کے کسی مخفی منصوبے کی تکمیل ہو رہی ہوتی ہے، اس سے کسی ایسے شخص کی خوشنودی اسے حاصل ہوتی ہے جس کی خوشنودی اسے اپنے دنیوی اغراض کے نقطۂ نظر سے مطلوب ہوتی ہے اس سے اس کے وہ ارمان پورے ہوتے ہیں جو نفس کی اکساہٹ سے اس کے اندر ہر وقت گدگدیاں پیدا کرتے رہتے ہیں لیکن وہ اتنی جرأت و ہمت نہیں رکھتا کہ ان چیزوں کی تکمیل کے لیے وہ صاف صاف نفس پرستی اور دنیا پرستی کے نام سے میدان میں اترے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی اس دنیاداری اور نفس پرستی کے لیے دین داری کی کوئی آڑ بھی تلاش کرلے تاکہ رندکا رند بھی رہ سکے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جانے پائے۔ اس خواہش کے تحت وہ مختلف قسم کے نظریات بناتا ہے اور ان کو مذہب کے اندر گھسانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر گھسانے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو پھر ان سے اپنی خواہشوں کے بند دروازوں کے کھولنے میں کلید کا کام لیتا ہے، خواہشاتِ نفس کے تحت فتوی لکھتا ہے اور ان کو کتاب و سنت کی طرف منسوب کرتا ہے، محض سفلی جذبات کی تسکین کے لیے بہت سے کام کرتا ہے اور ان کو معرفتِ الٰہی اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بناتا ہے۔

یہود نے جب چاہا کہ اپنی نفس پرستیوں کے لیے کوئی شرعی سندِ جواز پیدا کریں تو انہوں نے یہ نظریہ بنایا کہ ہم چونکہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ کی اولاد اور خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے ہم خواہ کچھ بھی کریں ہمارے لیے دائمی عذابِ دوزخ نہیں ہے، اول تو ہم دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی جائیں گے تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔ اپنے اس نظریے کو، جو محض نفس پرستی کی تحریک سے پیدا ہوا تھا انہوں نے اپنے دین میں گھسا دیا اور جب گھسا دیا تو ظاہر ہے کہ ان کی ساری شریعت ان کی خواہشوں کے سانچے میں ڈھل گئی۔ اس کے اندر جو حقوق اور جو درجے اور مرتبے ان کے لیے بیان ہوئے تھے ان کا تو وہ اپنے آپ کو پورا پورا موروثی حق دار

سمجھتے تھے لیکن جو ذمہ داریاں اس میں بیان ہوئی تھیں ان کی سرے سے ان کو کوئی پرواہی نہیں رہ گئی تھی، وہ اپنے مذکورہ نظریہ کی بدولت جزا و سزا اور دوزخ کی فکر سے بالکل فارغ البال ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کو اپنی خواہشوں کا ایک مجموعہ سمجھ رکھا ہے جس میں وہی باتیں لکھی ہوئی ہیں جن کو ان کا نفس پسند کرتا ہے۔

اسی طرح جب ان کے اندر سود کا رواج ہوا تو انہوں نے یہ نظریہ پیدا کیا کہ سود اگر حرام ہے تو خود اپنی قوم کے افراد یعنی بنی اسرائیل سے لینا حرام ہے نہ کہ دوسری کافر قوموں سے۔ اس نظریہ کو انہوں نے اپنے دین میں گھسایا اور پھر اس راہ سے انہوں نے اپنے سارے سودی کاروبار کو جایز کر لیا۔

اسی طرح عیسائیوں میں پال نے جب رومیوں میں عیسائیت کو مرغوب و مقبول بنانا چاہا تو اس نے سور اور شراب کو جایز قرار دے دیا اور اس کے لیے تاویل یہ کی کہ سور اور شراب کی حرمت اگر وارد ہے تو تورات میں وارد ہے نہ کہ انجیل میں اس وجہ سے بنی اسرائیل کے افراد کے لیے تو یہ چیزیں بے شک ناجایز ہیں لیکن دوسری قوموں کے جو لوگ مسیحیت قبول کریں ان کے لیے اس کے ناجایز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مسلمانوں پر اتباع ہوا کے تحت بدعتوں کا حملہ مختلف طرف سے ہوا۔ سب سے زیادہ یہ جنس باطنیہ نے پیدا کی۔ انہوں نے شریعت کی تمام قیود سے اپنے آپ کو آزاد کر لینے اور خواہشات نفس کو پوری پوری چھوٹ دیدینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شریعت کی تمام اصطلاحات کا مفہوم ہی یک سر بدل کے رکھ دیا۔ ان کی تعریف کے لحاظ سے نہ نبی نبی رہا نہ قرآن قرآن اور نہ روزہ روزہ رہا اور نہ نماز نماز۔ ہر چیز کے ظاہر و باطن کو انہوں نے اس طرح مسخ کر دیا کہ شریعت کا پورا حلیہ ہی بگڑ کر رہ گیا۔ مثلاً نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ کا فیضان ہو، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف لوٹ آنا ہے، جنابت سے مراد افشائے راز ہے، غسل سے مراد تجدید عہد ہے، زنا سے مراد علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا ہے جو عہد میں شریک نہ ہو، طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے سوا ہر مذہب سے برأت ہے، صلوٰۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوٰۃ سے مراد ذی صلاحیت لوگوں میں علم کی اشاعت ہے۔ فرقہ اسمٰعیلیہ اور بابیوں بہائیوں کا سارا نظام اسی طرح کے عجایب و غرایب پر کھڑا ہے۔ شیعوں کے ہاں متعہ اور اس طرح کی بعض دوسری چیزیں اسی قبیل سے تعلق

رکھتی ہیں۔ قادیانیوں نے بھی باطنیہ سے بہت کچھ لیا ہے۔

لیکن اس زمانہ میں باطنیہ کے حقیقی وارث منکرینِ حدیث ہیں۔ انہوں نے سنت کا انکار کرنے کے بعد تمام شرعی اصطلاحات۔ روزہ، نماز، حج، قربانی، جنت، دوزخ اور آخرت وغیرہ کی جو تاویلیں کرنی شروع کی ہیں، ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے مقصد اور باطنیہ کے مقصد، ان کے طریق کار اور باطنیہ کے طریق کار میں سر مو فرق نہیں ہے۔ آپ باطنیہ کے نظریات و عقاید اور ان کے نظریات و عقاید، ان کی تاویلیں اور باطنیہ کی تاویلیں آمنے سامنے رکھ لیجیے تو یہ حقیقت آپ پر بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ دونوں ایک ہی اب وجد کی اولاد اور ایک ہی شجرۂ الزقوم کے برگ و بار ہیں۔

اسی اتباع ہوا کا ایک مظہر ہمارے بعض اہل علم کا یہ نظریہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے جرموں اور گناہوں کی سزا اللہ تعالیٰ اسی دنیا کے مصایب و شدائد کے ذریعہ سے پوری کر دیتا ہے، دوزخ کی سزا ان کے لیے نہیں ہے۔ نیز بے علم اور کم عقل عوام کے ساتھ آخرت میں وہ معاملہ ہو گا جو کیڑوں مکوڑوں کے ساتھ ہوتا ہے ان کو جزا و سزا کی اس کسوٹی پر نہیں پرکھا جائے گا جس کا ذکر قرآن و حدیث میں ہوا ہے۔ یہ نظریہ یہودیوں کے اس نظریہ سے بالکل مشابہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہم کو دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ اور اس نظریہ نے ان کو شریعت کی حدود توڑنے کے لیے بالکل بے خوف و بے باک بنا دیا تھا۔ اسی طرح ہمارے ان نئے متکلمین نے بھی یہ نظریات عوام کو ان کی بے خبری اور شریعت سے بے پروائی پر مطمئن رکھنے کے لیے ایجاد فرمایا ہے تاکہ لوگ جس غلط روش پر ہیں اس پر جمے رہنے کے لیے ان کو ایک عقیدہ کا سہارا فراہم کر دیا جائے۔ اور آخرت کی بازپرس کی جو خلش بعض اوقات ستاتی رہتی ہے اس سے کم از کم حیلہ جو طبیعتوں کو بالکل ہی رہائی مل جائے۔

رخصت کا فلسفہ بھی، کم از کم اپنی موجودہ صورت میں اسی اتباع ہوا کا ایک مظہر ہے۔ دین کے اکثر مطالبات کے جواب میں آج بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان مطالبات کے دین کے مطالبات ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن حالات و مصالح کے تحت اسلام نے آخر رخصت سے بھی تو فایدہ اٹھانے کا حق دیا ہی؟ موجودہ زمانہ چونکہ ان باتوں کے لیے سازگار نہیں ہے اس وجہ سے جو کچھ ہو رہا ہے اسی کو گوارا کرنا چاہیے۔

حلقہائے تصوف سے وابستہ لوگوں کی جو بدعتیں اتباع ہوا کے تحت آتی ہیں وہ یوں تو بہت سی ہیں لیکن دو چیزیں بہت نمایاں ہیں ایک توساز کے ساتھ نغمہ کی بدعت دوسری یہ بدعت کہ بہت سے لوگ اس وسوسہ میں مبتلا ہو کر کہ وہ خدا رسیدہ ہو چکے ہیں اپنے آپ کو شریعت کی تمام پابندیوں اور ذمہ داریوں سے یک قلم آزاد کر لیتے ہیں۔ خانقاہوں اور مزارات پر اعرسوں میں جو صریح منکر باتیں ہوتی ہیں ان کا حوالہ میں اس وجہ سے نہیں دیتا کہ ان چیزوں کی ذمہ داری تصوف کے حامیوں کی طرف سے عوام پر ڈال دی جاتی ہے لیکن مذکورہ دونوں چیزوں کے متعلق تو یہ عذر کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔

نفقی طرز کی جو بدعتیں آج محض ہوا پرستی کی تحریک سے سامنے آرہی ہیں ان کا ایک بہترین نمونہ عائلی کمیشن کی وہ رپورٹ ہے جو مسلمانوں کے ازدواجی مسایل سے متعلق حکومت کے ایک مقرر کردہ کمیشن نے پیش کی ہے۔ اس رپورٹ کے مرتبین نے دعویٰ تو قدم قدم پر یہ کیا ہے کہ اس میں انھوں نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ تمام تر کتاب و سنت پر مبنی ہیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اس میں بیشتر مغربی ملکوں کے ازدواجی قوانین کی نقالی کی گئی ہے اور ان کو شریعت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے شرعی احکام کو پوری بے باکی کے ساتھ توڑا مروڑا گیا ہے۔

علاج بدعت کے اسباب واضح ہو جانے کے بعد اس کا علاج خود بخود سامنے آگیا وہ یہ کہ آدمی پوری مضبوطی کے ساتھ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر قایم رہنے اور دوسروں کو بھی قایم رکھنے کا اہتمام والتزام کرے۔ جس چیز کی جو حد کتاب و سنت میں قایم کر دی گئی ہے اس میں نہ کوئی زیادتی کرے نہ کوئی کمی، جس کا جو مرتبہ شریعت میں متعین کر دیا گیا ہے اس سے اس کا مرتبہ نہ اونچا کرنے کی کوشش کرے نہ نیچا۔ جو چیز دین میں جتنی مقدار میں مطلوب ہے اس میں محض اپنے جی سے نہ کوئی اضافہ کرے نہ کوئی تخفیف۔

اسی طرح اپنی خواہشوں میں سے کسی خواہش کو شریعت کا جامہ پہنانے کی کوشش نہ کرے۔ اپنے من گھڑت نظریات کو دین میں نہ گھسائے، اپنے ذاتی میلانات و رجحانات کو قرآن و حدیث کے نام سے پیش کرنے کا خواہشمند نہ بنے۔

یہ کام کہنے میں آسان ہے لیکن کرنے میں بڑا مشکل ہے۔ اس زمانہ میں حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ شریعت نے جن چیزوں کو منکر قرار دیا ہے وہ سوسائٹی میں معروف بن چکی ہیں اور جن چیزوں کو شریعت نے معروف بتایا ہے

وہ منکر قرار دے دی گئی ہیں۔ اس فسادِ حال کے سبب سے اگر کوئی شخص صحیح سنت پر قایم رہنا چاہے تو وہ سوسائٹی میں بالکل نکو بن کر رہ جاتا ہے، ہر جگہ اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ہر مجلس میں وہ خود بھی اپنے آپ کو اجنبی اور بے گانہ محسوس کرتا ہے اور دوسرے بھی اس کو اجنبی اور بے گانہ محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اصلاح کی بھی کوشش کرے تو یہ بے گانگی فوراً اختلاف اور کشمکش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر ہر جگہ اس کے خلاف ایک محاذِ جنگ قایم ہو جاتا ہے۔ یگانے اور بے گانے دونوں ہی اس سے الجھتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں، عزیز اور دوست دشمن بن جاتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں جو یا تو پہلے سے اس کے ہم خیال و ہم مسلک ہوں یا اس کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر اس کے ہم خیال بن چکے ہوں۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنا معمولی عزم و ہمت کے آدمی کا کام نہیں ہے یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دوسروں کی ناراضگیاں مول لے سکتے ہوں، جو حق کے لیے رشتوں اور قرابتوں سے بے پروا ہو سکتے ہوں، جو اللہ کے لیے ہر طرح کا نقصان گوارا کر سکتے ہوں اور جو بدعت کے مقابل میں سنت کی حمایت و نصرت کے لیے پہاڑ کی طرح مضبوط ہو کر کھڑے ہو سکتے ہوں۔

اس راہ میں آدمی کو سب سے زیادہ قیمتی رہ نمائی حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات صحابہؓ کی زندگیوں کے عملی نمونوں سے ملتی ہے۔ اگر آدمی انبیاء اور صحابہ کے حالات کا برابر مطالعہ کرتا رہے تو بدعات سے لڑنے کے لیے اس کے اندر برابر حرارت قایم رہتی ہے۔ اس امت میں سنت کے اہتمام اور بدعت کی مخالفت کے پہلو سے صحابہؓ کے بعد میرے نزدیک سب سے اونچا درجہ حضرت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ ان کی زندگی سراپا سنت ہے اور ان کا ایک ایک قول و فعل بدعت کے خلاف کھلم کھلا بغاوت۔ جب آدمی ان کے حالات کا مطالعہ کرتا ہے تو سنت کی حمایت اور بدعت کی مخالفت کے جذبہ سے اس کا دل سرشار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے اندر اس جذبہ کو زندہ رکھنا چاہیں ان کو حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی کا بار بار مطالعہ کرتے رہنے کا مشورہ دوں گا۔

عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ

(۳)

چند مشورے

از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

کمیشن کی جو تجاویز غلط اور مضر ہیں میں نے ان کی غلطیاں اور ان کے نقصانات تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ جن تجاویز سے میں نے بحث نہیں کی ہے وہ دو طرح کی ہیں۔ ان میں سے بعض تو مفید ہیں اور بعض اگرچہ مفید نہیں ہیں لیکن کچھ ایسی مضر بھی نہیں ہیں۔ کمیشن کی سب سے زیادہ مفید تجویز شادی بیاہ کی عدالتوں کے قیام سے متعلق ہے۔ یہ ایک ہی چیز اگر عمل میں آجائے تو ہزار خرابیوں کا علاج بن سکتی ہے۔ اگرچہ کمیشن نے اس کی جو شکل تجویز کی ہے اس میں بعض خلا محسوس ہوتے ہیں اور میں ان کی طرف اشارہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس خیال سے اغماض کیا کہ اگر اس تجویز نے عملی جامہ پہنا تو عمل میں آتے آتے یہ خلا خود بھر جائیں گے۔

اب میں چند باتیں اس ملک کے علمائے کرام اور اربابِ اقتدار اور ملک کی لیڈر خواتین کی خدمت میں الگ الگ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

علماء کی خدمت میں حضرات علماء کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ اس ملک میں اب اسلام کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک انہی کی یک جہتی، رواداری اور وسعتِ نظر پر ہے۔ اگرچہ مخالفِ اسلام عناصر اب یہاں کافی حد تک منظم ہو چکے ہیں اور اثر و نفوذ کے تمام وسائل و ذرائع انہی کے قبضہ میں ہیں تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کے عوام اور یہاں کا ذہین طبقہ بحیثیت مجموعی ابھی اسلام ہی کے ساتھ ہے اور اگر اہلِ دین متحد ہو کر اسلام کے لیے کام کریں تو وہ انہی کا ساتھ دے گا۔ ہمارے ذہین طبقہ میں دیوبندیت

اور بریلویت یا حنفیت اور اہل حدیثیت کی گروہی قسم کی معرکہ آرائیوں کے خلاف تو ضرور بیزاری پائی جاتی ہے اور اس بات کا نہایت قوی اندیشہ رہے کہ اگر جلد اس کے تدارک کی کوئی شکل نہ پیدا ہوئی تو یہ چیز ان میں سے بہتوں کو خود اسلام سے بھی بدگمان کر دے گی۔ لیکن خدا کے فضل سے ابھی اسلام کے خلاف ان کے اندر کوئی بے زاری نہیں پیدا ہوئی ہے اور اگر پیدا ہوئی بھی ہے تو ابھی وہ ایک نہایت ہی محدود دائرہ کے اندر ہے جس کو اگر خود علماء کی غلطی سے مزید غذا نہ مل گئی تو امید ہے کہ وہ متعدی نہیں ہونے پائے گی۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ دین کی تمام توجہ گروہی تعصبات کو بھڑکانے کے بجائے لوگوں کے اندر نفس اسلام کی حمیت کا شعور پیدا کرنے پر صرف ہو۔ جب بدقسمتی سے اس ملک میں خود اسلام کو بھی ایک مابہ النزاع چیز بنا دینے کے لیے سرگرمیاں جاری ہیں تو یہ کس قدر ناعاقبت اندیشی کی بات ہے کہ علماء ایسے مسایل پر مناظرے کی مجلسیں گرم کریں جن کی دین میں یا تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور اگر اہمیت ہے بھی تو بہرحال اتنی اہمیت نہیں ہے کہ ان کے لیے باہمی جنگ وجدال تک نوبت آجائے اور معاملات تھانوں اور عدالتوں تک پہونچیں۔ اگر اس طرح کے مسایل کچھ لوگوں کے نزدیک اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ لازماً ان کو زیرِ بحث لانا ہی چاہتے ہیں تو وہ اس کے لیے علمی اور تنقیدی بحث واستدلال کی راہ اختیار کریں۔ زمانہ زمانہ کا طریقِ بحث ونظر الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ زمانہ علمی بحث واستدلال کا زمانہ ہے اور اسی طریقہ سے لوگوں کو کسی خیال یا نظریہ کا قائل اور معتقد بنایا جاسکتا ہے۔ مناظرہ ومجادلہ کا طریقہ اس زمانہ میں ہرگز کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کرسکتا۔ نئے ذہن کو تو یہ چیز بالکل ہی اپیل نہیں کرتی بلکہ الٹے اس کے اندر اس طرح کی چیزوں کے خلاف ایک بیزاری پیدا ہو چکی ہے اور اگر ذہین طبقہ کے اندر کسی چیز کے خلاف بیزاری پھیل جائے تو پھر وہ انہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ بہت جلدی عوام کے اندر بھی اتر جاتی ہے۔

ہمارے علماء کو اس امر واقعی سے بھی بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ مخالفِ اسلام طاقتیں ان کی اس طرح کی غلطیوں کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنے مقصد کو تقویت دینے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ پریس کے ذریعہ سے یہ چیزیں خوب اچھالی جاتی ہیں اور ذہین طبقہ پر یہ اثر ڈالا جاتا ہے کہ اگر اس ملک میں مذہب کو زیادہ اہمیت دی گئی تو اس کے نتیجے یہی کچھ نکلیں گے۔ تاریخ نے اس سلسلہ میں ہمیں جو مفید درس دیے ہیں ہم بڑے ہی نادان ہوں گے اگر ان کو فراموش کر دیں۔ اگر ہم اس طرح کی غلطیوں پر مصر رہے تو اس ملک میں مذہب کو

ختم کر دینے کی ذمہ داری یہاں کے مخالفین اسلام پر نہیں بلکہ یہاں کے علما پر عائد ہوگی۔ مخالفین تو اب تک ہر قسم کا زور و اثر رکھنے کے باوجود خدا کے فضل سے ہر محاذ پر شکست ہی کھاتے رہے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہی رہی ہے کہ علماء اور ملک کے عوام نے اب تک یک جہتی کا ثبوت دیا ہے لیکن مخالفین کی یہ شکست خدا نخواستہ فتح سے بھی بدل سکتی ہے اگر وہ اہل دین کو فروعی مسائل کی جنگ میں الجھا دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس ملک میں ایک اسلامی طرز کا دستور بن جانے کے بعد یہاں اسلام کی جڑیں اب کافی نیچے تک اتر چکی ہیں۔ مخالفین اب یہ حوصلہ نہیں کر سکتے کہ اس کو یہاں سے اکھاڑ پھینکیں۔ اب یہاں اسلام کو کمزور کرنے کے لیے واحد تدبیر جس پر وہ اعتماد کر سکتے ہیں یہی ہے کہ یہاں فروعی اختلافات کو خوب ہوا دی جائے تاکہ مختلف فرقوں کی جنگ وجدل کے ہنگامہ میں اسلامی قانون کے نفاذ کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے۔

ہمارے علماء اس وقت بڑے ہی سخت امتحان میں ہیں۔ دستور میں انھوں نے جس اسلامی قانون کے نفاذ و اجرا کی ضمانت حاصل کی ہے وہ بالکل ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گی اگر انھوں نے ہر قسم کے گروہی تعصبات اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہو کر اصل دین پر نگاہ نہیں جمائی۔ آپ اپنے انفرادی دائرہ کے اندر جس مسلک کے چاہیں پیرو رہیں لیکن ملک کو ایک اعلیٰ اور معیاری قانون دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ پوری فقہ اسلامی پر بغیر کسی تعصب کے نگاہ ڈالیں اور اس کو بحیثیت مجموعی اپنا مشترک سرمایہ سمجھیں۔ فقہ حنفی ہو یا فقہ مالکی، فقہ شافعی ہو یا فقہ حنبلی یہ سب ہماری اپنی ہی فقہیں ہیں اور جن بزرگ ہستیوں کی کوششوں اور کاوشوں سے یہ وجود میں آئی ہیں وہ سب ہمارے مشترک ائمہ و علما ہیں۔ ہم ان سب کا یکساں احترام کرتے ہیں اور ان کے اوپر یکساں اعتماد رکھتے ہیں۔ تبحر اور تقویٰ کے لحاظ سے یہ ائمہ ہماری تاریخ کے گل سرسبد ہیں اور ہم بلا کسی تفریق و تعصب کے ان سب پر فخر اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اپنے فضل خاص سے اس امت میں ایسے ایسے مجتہدین اٹھائے جن کے اجتہادی کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ ہم ان میں سے کسی کو بھی معصوم اور تنقید سے بالاتر نہیں مانتے۔ ہمیں خود انہی بزرگ ائمہ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہمارے لیے ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اپنے آپ کو باندھ دینا جائز نہیں ہے بلکہ اصل شے تو کتاب و سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا ہے جس کا دین میں مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہمیں انھوں نے تنقید سے روکا

نہیں ہے بلکہ تنقید کی دعوت دی ہے۔ انہوں نے ہم سے خود یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم اُن کے اجتہادات و اقوال کو اصل کسوٹی پر جانچیں پرکھیں اور جس کے اجتہاد کو کتاب و سنت سے قریب تر پائیں اس کو اختیار کریں۔ کتاب و سنت سے قریب تر کی تلاش میں اہل علم کا غلطی کر جانا اُس صواب سے بہتر ہے جو محض تقلیدِ جامد کا نتیجہ ہو۔

ہمیں اس ملک میں ایسے لوگوں سے سابقہ ہے جن کے ذہنوں کو نئی تعلیم نے مسموم کر رکھا ہے اور بدقسمتی سے یہی گروہ اس وقت رہنمائی اور قیادت کی مسندوں پر جلوہ افروز ہے۔ یہ لوگ دین کی ہر بات میں مین میخ نکالنے کے عادی ہیں، اور ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ وضعی قوانین کے مقابل میں اسلامی قوانین کو فروتر ثابت کریں اور نئی نسلوں کو اس سے بدگمان کریں۔ ان سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک دو باتیں پورے اہتمام کے ساتھ پیش نظر نہ رکھی جائیں۔ ایک یہ کہ اختیار کرنے کی چیز اسلام اور اسلامی فقہ بحیثیتِ مجموعی ہے نہ کہ کوئی ایک متعین فقہ۔ اسلامی فقہ بحیثیتِ مجموعی تو بلاشبہ ایک ایسی گراں مایہ چیز ہے جس کی برتری دنیا کے تمام وضعی قوانین کے مقابل میں ثابت کی جا سکتی ہے اور ہٹ دھرموں کے سوا کوئی اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن اگر کسی ایک ہی متعین فقہ پر اسلامی قانون کے اجرا و نفاذ کو منحصر کر دیا گیا اور اس پر ضد کی گئی تو اس کے خلاف مخالفوں کو کہنے کا بہت کچھ مواد ملے گا اور یہ چیز اسلامی قوانین کے نفاذ کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا کرے گی۔ دوسری یہ کہ موجودہ زمانہ کے ذہن کو مجرد یہ چیز اپیل نہیں کر سکتی کہ فلاں چیز فقہ کی فلاں کتاب میں لکھی ہوئی ہے بلکہ لوگوں کو قائل اور مطمئن کرنے کے لیے ایک طرف تو ہر بات کے وہ دلائل دینے ہوں گے جو اصل کتاب و سنت سے نکلتے ہیں اور دوسری طرف وضعی قوانین کے مقابل میں اسلامی قانون کی عقلی اور اجتماعی حکمتیں اور مصلحتیں بھی واضح کرنی ہوں گی۔ ان دونوں باتوں کے بغیر اسلامی قانون کی برتری کا لوگوں کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ یہاں قائلوں کو قائل کرنا نہیں ہے بلکہ بدقسمتی سے صورت حال کچھ ایسی بن گئی ہے کہ شکیوں اور منکروں کو از سر نو اسلامی قانون کی خوبیوں کا قائل کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ظاہر ہے کہ حامیانِ دین کو مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے اور مختلف مکاتیب فکر کے علم برداروں کی حیثیت سے میدان میں نہیں آنا ہے بلکہ اس طرح آنا ہے جس طرح ایک ٹیم ایک مشترک مقصد لیکن مختلف ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے میدان میں اترتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنے الگ الگ

تشخصات و امتیازات یک قلم بھول جائیں۔ اگر آپ ان کو باقی رکھنا ہی چاہتے ہیں تو باقی رکھیے لیکن ان کو اپنے اپنے دائروں ہی تک محدود رکھیے جس نشان سے ملکی اور اجتماعی قوانین کی حد شروع ہوتی ہے وہاں سے آپ اسلام کے تحت ہر بات کو ماننے اور ہر بات کو چھوڑنے کے لیے تیار رہیے اور اپنے اپنے مخصوص فقہی نقطہ ہائے نظر پر اصرار کرنے کے بجائے ہر اس نقطہ نظر کا خیر مقدم کیجیے جو کتاب و سنت سے موافقت اور مصالح و حالات سے مطابقت رکھنے والا نظر آئے۔

پچھلی چند صدیوں میں ہماری بعض مسلمان حکومتوں میں اسلامی قانون کو مدون کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان کو وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو حاصل ہونی چاہیے تھی۔ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ عموماً قانون کے مدون کرنے والوں نے پوری اسلامی فقہ کو اپنا ماخذ بنانے کے بجائے کسی ایک ہی فقہ کو اپنا ماخذ بنایا۔ اس پابندی کی وجہ سے وہ کوئی معیاری چیز سامنے نہ لا سکے اور بہت جلد اس کی خامیاں محسوس کی جانے لگیں۔ چنانچہ انہی تجربات کی وجہ سے ادھر ماضی قریب میں کسی ایک ہی متعین فقہ کو اساس بنانے کے بجائے یہ رجحان غالب رہا ہے کہ پوری فقہ اسلامی کو اساس کار بنایا جائے۔ میں نے ان تمام رجحانات کی تفصیل اپنی کتاب "اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل" میں پیش کی ہے۔ یہاں میں صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ابتدا ہی سے ایک وسیع زاویہ نگاہ کے تحت اس کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ نہ قدیم تعصبات کو اس راہ میں رکاوٹ بننے دینا چاہیے اور نہ جدید تعصبات کو ابھرنے کا موقع دینا چاہیے۔

ارباب اقتدار کی خدمت میں ارباب اقتدار کی خدمت میں مجھے کئی باتیں عرض کرنی ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد ہی سے اس ملک میں نظریات کی جو کشمکش برپا ہے دستور کے بن جانے کے بعد اسے ختم ہو جانا چاہیے۔ اس کے ختم ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے ارباب کار کے ذہن اب اسلام کے حق میں یکسو ہو جائیں۔ اب تک کچھ صورت حال ایسی رہی ہے کہ جہاں تک عوام اور اس ملک کے دین دار طبقہ کا تعلق ہے وہ تو اس دستور کے بن جانے پر مطمئن اور دل سے اس بات کا خواہشمند ہے کہ اس ملک کا سیاسی اور اجتماعی ارتقا انہی خطوط پر ہو جو دستور میں طے کر دیے گئے ہیں لیکن

جہاں تک ملک کے کارفرماؤں کا تعلق ہے ان کے رویہ سے کچھ ایسا مترشح ہو رہا ہے کہ وہ اس دستور کو ایک ناشدنی واقعہ سمجھتے ہیں اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوگئی ہیں ان کو وہ ایک بوجھ محسوس کر رہے ہیں۔ شاید اسی چیز کا یہ اثر ہے کہ اب تک انہوں نے دستور کے تقاضوں کی سمت میں ایک قدم بھی ایسا نہیں اٹھایا ہے جس سے پبلک یہ اندازہ کرسکے کہ یہ دستور اس ملک میں فی الواقع نافذ ہوچکا ہے۔ اسلام اور جاہلیت کے درمیان کشمکش کی جو حالت دستور کے نفاذ سے پہلے موجود تھی وہی حالت اب بھی قائم ہے۔ قول اور عمل میں جو تضاد پہلے نظر آتا تھا وہ اب بھی ہر جگہ نظر آرہا ہے۔ فکر و نظر میں جو الجھنیں پہلے نمایاں تھیں وہ اب بھی نمایاں ہیں، کتاب و سنت کا نام لے کر جاہلیت کو فروغ دینے کی جو سرگرمیاں پہلے جاری تھیں وہ اب بھی بدستور جاری ہیں، مخالف اسلام عناصر جس طرح دستور کے نفاذ سے پہلے ایک طمع خام میں مبتلا تھے اسی طرح اب بھی وہ اپنی غلط توقعات کے بروئے کار آنے سے مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں کی اصلی وجہ ہمارے نزدیک یہی ہے کہ ہمارے کار فرما حضرات ابھی اس بارے میں یکسو نہیں ہیں کہ انہیں کس سمت میں جانا ہے اور اس ملک کو کس راہ پر آگے بڑھانا ہے۔ ان کے اس تذبذب نے ان کو اور ان کے ساتھ ساتھ اس پورے ملک کو اس دستور کے حقیقی فائدہ سے اب تک بالکل محروم کر رکھا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک دستور کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے؟ یہ نہ تو کوئی کھانے کی چیز ہے نہ پہننے کی۔ اس کا اگر کوئی فائدہ ہے تو یہی ہے کہ اس سے کسی قوم یا ملک کی راہ عمل معین ہو جاتی ہے۔ اگر ہم نے اپنے اس دستور سے یہ فائدہ بھی حاصل نہ کیا تو جس چیز کے لیے لوگ آٹھ نو سال تک چیختے رہے اس سے حاصل کیا ہوا؟ اس کا نتیجہ یہ تو کم از کم ہونا تھا کہ اسلام اور جاہلیت میں سے کسی ایک چیز کو ہم کھلے دل سے انتخاب کر لیتے اور کسی ایک سمت میں یکسو ہو کر چل کھڑے ہوتے۔ لیکن یہاں تو صاف نظر آرہا ہے کہ دورنگی اور شتر گربگی کی جو پالیسی پہلے کام کر رہی تھی وہی اب بھی کام کر رہی ہے۔ اسلام کا حوالہ دیتے ہوئے قدم قدم پر جس جاہلیت کی سرپرستی پہلے ہو رہی تھی، کتاب و سنت کا وظیفہ پڑھتے ہوئے اسی جاہلیت کی سرپرستی اب بھی ہو رہی ہے۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ان کار فرماؤں کو بالکل اندازہ نہیں ہے کہ عام مسلمانوں کے ذہن پر اس روش کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر یہ تھا کہ یہ حضرات جو کچھ کرتے صاف صاف جاہلیت کے نام سے کرتے۔

لیکن کتاب و سنت کے نام سے اس طرح کی رپورٹیں مرتب کر ڈالنا جیسی رپورٹ خلیفہ عبد الحکیم صاحب اور ان کے ساتھیوں نے مرتب کی ہے کتاب و سنت کے ساتھ ایک ایسا سنگ دلانہ مذاق ہے جسکو کوئی بھی حساس مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔

۲۔ دوسری گذارش یہ ہے کہ اس ملک میں اسلامی قانون کی ترتیب و تدوین اور اس کے نفاذ و اجرا کا اصلی واسطہ از روئے دستور وہ کمیشن ہے جو صدر ریاست مقرر کرے گا۔ اب اس ملک کی ساری توقعات اسی کمیشن سے وابستہ ہیں۔ اگر یہ کمیشن صحیح قسم کے اشخاص پر مشتمل ہوا تو لوگوں کو ان ضمانتوں پر اعتماد ہو گا جو دستور میں اسلامی قوانین کے نفاذ سے متعلق دی گئی ہیں اور اگر وہ کمیشن بھی میاں عبد الرشید صاحب اور خلیفہ عبد الحکیم صاحب ہی جیسے افراد سے مرکب ہوا تو لوگ اس دستور سے بالکل ہی مایوس ہو جائیں گے۔ اگر عائلی کمیشن نے فی الواقع ایک فیلر (F E E L E R) چھوڑا تھا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے تو مجھے توقع ہے کہ اس فیلر سے حکومت کو یہ اندازہ اچھی طرح ہو گیا ہو گا کہ اس ملک میں اس طرح کے اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے جس قسم کا اسلام یہ حضرات لانا چاہتے ہیں۔ اس اندازہ سے حکومت کو فائدہ اٹھانا چاہیے اور آئندہ کمیشن میں اس قسم کے افراد کے لیے کوئی گنجائش نہ ہونی چاہیے جو نہ اسلام کو جانتے ہی ہوں اور نہ اس کو مانتے ہی ہوں۔ اس کمیشن میں علماء کے طبقہ میں سے جو لوگ لیے جائیں وہ بھی ایسے ہونے چاہییں جن کی فکر و بصیرت پر لوگوں کو اعتماد ہو اور وضعی قوانین کے ماہرین میں سے بھی وہ لوگ منتخب کیے جائیں جو اسلام پر ایمان و اعتقاد رکھتے ہوں۔ جن لوگوں کی ساری زندگی اسلام کی تحریف و تضحیک میں گذری ہے ان کو اس کے اندر گھسا دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ لوگوں کے اندر اس کمیشن کے کام کے خلاف ایک شدید قسم کی نفرت و بے زاری پیدا ہو اور ساتھ ہی لوگ حکومت اور دستور کی طرف سے بھی بدگمان ہوں۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ صدر ریاست اس اہم فرض کو صحیح طور پر انجام دینے کی توفیق پائیں اور عائلی کمیشن کی رپورٹ نے لوگوں کے اندر جو نفرت و بیزاری پیدا کر دی ہے وہ دور ہو۔

۳۔ تیسری گذارش یہ ہے کہ جو مقاصد تعلیمی اور دعوتی ذرائع سے حاصل کیے جا سکتے ہیں ان کے لیے

خواہ مخواہ کو قانون کا لٹھ نہ گھمایا جائے۔ قانون سے پابندیوں میں تو اضافے ہو جاتے ہیں لیکن اس کے بل پر لوگوں کو کسی چیز کا قائل اور معتقد نہیں بنایا جا سکتا۔ کسی قوم کی تہذیب و تمدن میں اصلی رنگ انہی چیزوں کا ابھرتا ہے جو تعلیم و دعوت کی راہ سے اس کے دل و دماغ میں سرایت کرتی ہیں۔ ہمارے پاس نشر و اشاعت کے جو وسیع ذرائع ہیں وہ رات دن مزخرفات کی اشاعت کر رہے ہیں اگر ہم ان کو ان چیزوں کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنائیں جن سے ہمارے ملک کے عوام بے خبر ہیں تو بہت سی بے ضرورت قانون سازی سے ہم مستغنی ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ نکاح و طلاق وغیرہ کے واقعات سے متعلق ضروری تفصیلات کے ریکارڈ لوگ محفوظ رکھیں یا کم سنی کی شادیاں رک جائیں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے لیے لازماً قوانین ہی بنا کر لوگوں کو باندھنے اور پابند کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ پروپیگنڈے اور تعلیم کے ذریعہ سے ان چیزوں کے فوائد مختلف طریقوں سے ذہن نشین کرانے چاہییں۔ یہاں تک کہ ان چیزوں کا اہتمام سوسائٹی کے مزاج میں داخل ہو جائے۔ قانون کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب ایک برائی کا استیصال تعلیم و دعوت سے ناممکن ہو اور اس سے لوگوں کے حقوق تلف ہو رہے ہوں۔ اگر معیاری نکاح نامے اور طلاق نامے چھپے ہوئے لوگوں کو با آسانی دستیاب ہونے لگیں اور لوگوں میں ان کی اہمیت اور افادیت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہمارے معاشرہ میں اس کا عام رواج نہ ہو جائے۔

۴۔ کمیشن نے جن امور کے بارے میں سفارشات پیش کی ہیں ان میں تین مسئلے ایسے ہیں جن کے بعض پہلو واقعی قابل توجہ ہیں۔ ایک طلاق ثلاثہ کا مسئلہ ہے۔ دوسرا مروجہ تعدد ازدواج کے سبب سے بعض ناانصافیوں کے ازالہ کا مسئلہ اور تیسرا یتامیٰ کے حقوق کا مسئلہ۔ ان تینوں سے متعلق ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت کی جو ذمہ داریاں ہیں میں وہ یہاں بیان کیے دیتا ہوں۔ اگر حکومتِ پاکستان اس روشنی میں ان مسائل پر غور کرے گی تو وہ ان تینوں مسائل کو نہایت خوبی سے حل کر سکتی ہے۔

طلاق ثلاثہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بارے میں اس امر میں تو اختلاف ہوا ہے کہ یہ بائن ہوتی ہیں یا بائن نہیں ہوتیں۔ جمہور کے نزدیک یہ بائن ہو جاتی ہیں اور ایک گروہ کے نزدیک صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ طلاق دینے کا یہ طریقہ مسنون طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک عاجلانہ

اور بھونڈا طریقہ ہے جس سے آدمی ان بہت سے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے جو مسنون طریقۂ طلاق میں موجود ہیں۔ اس چیز پر نہ صرف تمام اہل سنت متفق ہیں بلکہ جہاں تک مجھے علم ہے شیعہ حضرات بھی اس پر متفق ہیں۔ لیکن یہ ایک نہایت افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے عوام و خواص کی اکثریت اس امر واقعی سے بالکل بے خبر ہے کہ یہ طریقہ کتاب اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف ہے' اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کا اظہار فرمایا ہے' اس پر حضرت عمرؓ نے بعض لوگوں کو سزا بھی دی ہے اور اس کے سد باب ہی کے لیے انہوں نے ایک مجلس میں دی ہوئی طلاقوں کو نافذ کر دیا خواہ وہ کسی شکل میں دی گئی ہوں۔

اب مسئلہ کا یہ پہلو لوگوں کی نگاہوں سے تقریباً اوجھل ہو چکا ہے۔ اب اگر لوگوں کو معلوم ہے تو بس یہ معلوم ہے کہ طلاق دینے کا عام طریقہ بالخصوص حنفی طریقہ یہی ہے۔ یہ غلطی عام ذہنوں میں اس طرح بیٹھ چکی ہے کہ اگر کسی کو بتائیے کہ طلاق دینے کا یہ طریقہ خود احناف کے نزدیک بھی کتاب اللہ کے ساتھ استہزاء کے حکم میں داخل ہے اور ایک صحیح اسلامی حکومت میں اس طرح طلاق دینے والا سزا کا بھی مستوجب ہو سکتا ہے تو وہ شخص حیرت سے منہ تکنے لگتا ہے۔

لوگوں کی اس عام بے خبری کا سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ مسلمان ایک مدت سے کسی ایسے نظام کی برکتوں سے محروم ہیں جو ان کو منکر سے روکنے والا اور معروف کا حکم دینے والا ہو' اور اس کی دوسری وجہ ہمارے حنفی علماء کی اس معاملہ میں عام سہل انگاری اور بے پروائی ہے۔ یہ حضرات (بے ادبی معاف فرمائیں) اس امر میں اپنی ذمہ داری صرف یہ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کا اس طرح کا کوئی مسئلہ ان کے سامنے آجائے تو "طلاق واقع ہو گئی" کا فتویٰ دے کر اپنے فرض سے سبک دوش ہو جائیں۔ اس میں کتاب اللہ کے ساتھ استہزاء اور سنت رسول اللہ کی خلاف ورزی کا جو پہلو ہے اس کی روک تھام یا اس کی اصلاح کی کوئی ذمہ داری یہ اپنے اوپر نہیں سمجھتے۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلک کی' جس کے اوپر احناف کا فتویٰ ہے' اصلی روح یہی تھی کہ لوگوں کو کتاب اللہ کے بتائے ہوئے طریقۂ طلاق کا پابند بنایا جائے نہ کہ صرف طلاق واقع کر دی جائے۔ اگر ہمارے حنفی علماء نے اپنی اصلی ذمہ داری محسوس کی ہوتی اور وہ اپنی کتابوں' اپنی تقریروں اور اپنے فتووں میں برابر اس حقیقت کو لوگوں کے سامنے واضح کرتے رہتے کہ اس طرح اگرچہ طلاق واقع تو ہو جاتی ہے لیکن یہ طریقہ

قرآن اور حدیث کے خلاف ہے، اس سے آدمی خدا کی بخشی ہوئی سہولتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور گنہ گار بھی ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ طلاق کے مسنون طریقہ کے بجائے ایک عاجلانہ طریقہ لوگوں میں اس طرح رواج پکڑ جاتا کہ لوگ اسی طریقہ کو مسنون طریقہ سمجھنے لگ جاتے۔

اب اگر حکومت اس غلط طریقۂ طلاق کی اصلاح کرنا چاہتی ہے تو اس کا راستہ یہ نہیں ہے کہ وہ جمہور کے متفقہ مسلک کے خلاف ایک قانون بنا کے رکھ دے بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو مسئلہ کی صحیح صورت سے اچھی طرح آگاہ کیا جائے۔ اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ملک کے تمام مستند بالخصوص حنفی علماء سے ریڈیو پر صحیح طریقہ طلاق پر تقریریں کرائی جائیں، جن میں عاجلانہ طریقہ طلاق کی خرابیاں واضح کی جائیں اور مسنون طریقہ کی حکمتیں بیان کی جائیں نیز اس امر کو اچھی طرح واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدینے سے آدمی گنہ گار ہوتا ہے۔ اس موضوع پر کتابیں اور پمفلٹ بھی شائع کیے جائیں اور عام پبلک اجتماعات اور جمعہ کی تقریروں میں بھی لوگوں کو اس سے باخبر کرنے کی کوشش کی جائے۔ چونکہ یہ ایک متفق علیہ بات ہے اس وجہ سے توقع ہے کہ بہت جلد لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی یہ رجحان کم نہ ہو تو پھر قانون میں اس طرح طلاق دینے والے کے لیے کوئی سزا بھی رکھی جا سکتی ہے۔

تعدد ازدواج تعدد ازدواج کے سلسلہ میں جو چیز قابل اصلاح ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ، ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی تو رچا لیتے ہیں کہ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے لیکن اس اجازت کے ساتھ عدل کی جو شرط لگی ہوئی ہے وہ ان کو یاد نہیں رہتی اور وہ پہلی بیوی کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بالکل معلقہ بنا کے رکھ چھوڑتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس افسوسناک صورتِ حال کے پائے جانے کے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، دو بڑے سبب ہیں۔ ایک یہ کہ عورتوں کے اندر اپنے حقوق کا صحیح احساس موجود نہیں ہے، وہ زندگی بھر ایک معلقہ کی حیثیت سے زندگی گذار دیتی ہیں لیکن اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے ان کے اندر کوئی ہمت نہیں پیدا ہوتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ان کے اندر اپنے حقوق کا کوئی احساس پیدا ہو بھی اور وہ ان کو حاصل کرنا بھی چاہیں تو ان کے حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے وہ استمداد کر سکیں۔ ہمارا موجودہ عدالتی نظام اتنا مہنگا اور اتنا پیچیدہ ہے کہ اس سے انصاف حاصل کرنا کمزوروں اور غریبوں

کے لیے نونا ممکن ہے۔

ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے تین طریقے آسانی کے ساتھ اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ ملک کے عام اصلاحی ادارے خصوصاً خواتین کی انجمنیں عورتوں کے اندر ان کے حقوق کا احساس پیدا کریں۔ تقریروں، تحریروں نیز انفرادی و اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ سے دیہاتوں تک کی خواتین کو یہ اچھی طرح بتایا جائے کہ اسلام نے ان کو کیا حقوق بخشے ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس معاملہ میں حکومت کے محکمہ نشر و اشاعت کو بھی ان پبلک اداروں اور خواتین کی انجمنوں کی مدد کرنی چاہیے۔

دوسرا یہ کہ ہمارے یہاں بھی وسیع پیمانے پر پنچایتی نظام قائم کیا جائے اور اس کو دیہاتی علاقوں میں خصوصیت کے ساتھ پوری وسعت دی جائے۔ اس پنچایتی نظام کو جہاں دوسرے اصلاحی کاموں کا ذریعہ بنایا جائے وہاں اس کو اس طرح کی گھریلو ناانصافیوں کو دور کرنے کا بھی واسطہ بنایا جائے۔ اور اس کے لیے ایک خاص حد تک ان پنچایتوں کو اختیارات بھی دیے جائیں۔

تیسرا یہ کہ اس طرح کی تمام نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لیے شادی بیاہ کی اُس قسم کی عدالتیں قائم کی جائیں جس طرح کی عدالتیں کمیشن نے تجویز کی ہیں۔

اگر یہ تینوں طریقے اختیار کر لیے جائیں تو ہمیں امید ہے کہ نہ صرف وہ ناانصافیاں دور ہو جائیں گی جو تعدد ازدواج کی اجازت کے سوء استعمال سے ہمارے معاشرے کے اندر پائی جاتی ہیں بلکہ اگر ہمارے معاشرہ کے کسی طبقہ میں غلط اور غیر ضروری قسم کا تعدد ازدواج پایا جاتا ہے تو وہ بھی بالتدریج ختم ہو جائے گا۔

یتیموں کا مسئلہ یتیموں کا مسئلہ صرف اسی ایک پہلو سے غور کرنے کا نہیں ہے کہ بعض یتیم اپنے دادا کی جائداد میں سے حصہ نہیں پاتے۔ یہ مشکل تو کہیں ہزاروں یتیموں میں سے دو چار کو پیش آتی ہے اور عموماً اچھے گھرانوں میں آپ سے آپ اس کا حل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنی عمر میں اب تک میرے سامنے پوتے کی محرومی کے جتنے واقعات پیش آئے ہیں میں نے یہ دیکھا ہے کہ دادا اور چچا کی محبت و شفقت سے یہ مسئلہ نہایت خوبی سے خود حل ہو گیا ہے۔ اگر بالفرض نہیں بھی حل ہوا ہے تو دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہمارے ملک کے لاکھوں یتیموں

میں سے یہ کتنے یتیموں کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ نے اسلام کے سارے ضابطۂ وراثت کو توڑ تاڑ کر اس کو اپنے خیال کے مطابق حل بھی کر دیا تو اس سے کتنے فی صد یتیموں کی مشکل حل ہو گی۔ ملک کے یتیموں میں ہزاروں لاکھوں یتیم تو ایسے ہیں جن کا واحد سہارا ان کے باپ کا سایہ ہی تھا۔ اس کے اٹھ جانے کے بعد خدا کے سوا ان کا کوئی سہارا نہیں ہے، نہ بالشت بھر زمین ہے نہ زندگی بسر کرنے کا کوئی اور ذریعہ۔ اسی وجہ سے اسلام نے یتیموں کے مسئلہ پر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ اجتماعی حیثیت سے نگاہ ڈالی ہے اور اس کو اس طرح حل کیا ہے جس سے ہر یتیم کا مسئلہ حل ہو نہ کہ صرف ان چند یتیموں کا جو اپنے دادا کی جائداد میں حصہ پانے سے محروم ہو گئے ہوں۔

اسلام نے افراد، معاشرہ اور ریاست تینوں پر یتیموں سے متعلق نہایت اہم ذمہ داریاں ڈالی ہیں اسلام کے نقطۂ نظر سے کوئی فرد ایک سچا مسلمان نہیں، کوئی معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ نہیں اور کوئی ریاست ایک صحیح اسلامی ریاست نہیں جب تک یہ درجہ بدرجہ یتیموں سے متعلق اپنے فرائض ادا نہ کر دیں۔

اسلام نے الگ الگ افراد سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے اپنے کنبہ اور خاندان کے یتیموں کے ذمہ دار ہیں۔ ہر شخص پر اس کے قریبی رشتہ داروں کے بعد دوسرے نمبر پر اس خاندان کے یتیموں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر یتیم کی کوئی جائداد ہے تو اس کی دیکھ بھال اس کے ولی کے ذمہ ہے اور یہ ذمہ داری حتی الامکان بغیر کسی اجرت اور معاوضہ کے اٹھانی چاہیے، اور ہرگز اس جائداد میں کوئی ایسا تصرف نہیں کرنا چاہیے جس سے اس کو کسی قسم کا نقصان پہونچے۔ اور اگر یتیم کی کوئی جائداد نہیں ہے تو ادلیاء و اقرباء کے تمام احسانات و تبرعات کا سب سے اول حق دار یہ یتیم ہے نہ کہ کوئی دوسرا۔

معاشرہ پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے تمام مالدار افراد کے مال میں اسلام نے ایک حصہ مقرر کر دیا ہے جو سب کا سب صرف غریبوں اور یتیموں ہی کا حق ہے اور یہ اہل نصاب کی آمدنیوں میں سے وصول بھی ایک حق ہی کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اگر دینے والے نہ دیں تو حکومت قانون کے زور سے ان سے وصول کر سکتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر حکومت ضرورت محسوس کرے تو ان کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کر سکتی ہے۔

ریاست پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس کی جو خاص آمدنیاں ہیں ان میں بھی یتیموں کو شریک کر دیا گیا ہے تاکہ ریاست اپنی ترقیاتی اسکیموں میں سے کسی اسکیم میں بھی یتیموں کی فلاح و بہبود کے نصب العین سے بے پروا نہ ہو سکے۔ یتیموں کے اسی حق غالب کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پورے بیت المال کو یتیموں کا مال کہتے تھے اور اس میں سے اپنے کفاف سے زائد لینے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ہماری اس اسلامی ریاست میں جو عہد رسالت میں قائم ہوئی یتیموں کے حق کا یہ اعزاز تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اقربا کے حق کے بعد دوسرے ہی نمبر پر یتامیٰ کا حق بیان ہوا اور صدقات و زکوٰۃ میں نہیں بلکہ مفتوحات اور اموالِ غنیمت میں ملاحظہ ہو انفال آیت ۴۱۔

بہر حال جہاں تک ایک صحیح اسلامی ریاست کا تعلق ہے اس میں یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک یتیم نے اپنے دادا کی جائداد میں سے حصہ پایا یا نہیں۔ حکومت اس کا بوجھ دادا پر ڈالنے کے بجائے خود اٹھاتی ہے اور اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی ذمہ داریاں خود اٹھا سکے۔ جو لوگ محض اس چیز کے سبب سے اسلام کے قانون وراثت پر حرف گیری کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کو جاہلیت کی یادگار اور ایک ظلمِ عظیم قرار دیتے ہیں وہ اسلام کے نظام کی اس حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہیں کہ اس میں سب سے بڑا حق یتیم ہی کا ہے۔ اس ملک میں بھی اگر یتیموں کا مسئلہ صحیح طور پر حل کرنا ہے تو اسی طریقہ پر حل کیجیے جس طریقہ پر اس کو اسلام نے حل کیا ہے۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ یتیم کے سارے حقوق تو آپ کے غلط نظام کے پیٹ میں ہوں اور آپ اسلام کو گالیاں دیں کہ اس نے دادا کی جائداد میں سے پوتے کو وراثت کیوں نہ دلوائی؟

خواتین کی خدمت میں اب میں آخر میں دو ضروری باتیں ان مسلمان بہنوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں جو اس ملک کی مسلمان خواتین کی رہنمائی کرنا چاہتی ہیں۔

ان کی خدمت میں پہلی گذارش یہ ہے کہ یہ بھی اس امر میں یکسو ہو جائیں کہ انہیں مغربی عورتوں کی نقالی کرنی ہے یا وہ حقوق لینے ہیں جو اسلام نے ان کو بخشے ہیں۔ اگر مغربی عورتوں کی نقالی کرنی ہے تو وہ بصد اپنے اس شوق کے پیچھے اسلام کو [illegible] میں نہ گھسیٹیں۔ اسلام ان کا کوئی خانہ زاد غلام نہیں ہے کہ وہ جو کچھ

چاہیں وہ اس کی تائید کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور ہاتھ باندھے پیچھے پیچھے پھرتا رہے۔ اس مقصد کے لیے انھیں اسلام کا نام استعمال کرنے کے بجائے انہی نعروں کے ساتھ میدان میں آنا چاہیے جن نعروں کے ساتھ ان کی مغربی بہنیں اس میدان میں آئیں اور صاف صاف کہنا چاہیے کہ ہمیں اسلام نہیں بلکہ انہی معنوں میں آزادی اور مساوات چاہیے جن معنوں میں ہماری مغربی بہنوں کو آزادی اور مساوات حاصل ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس ملک میں یہ لڑائی ان کو سستی پڑے گی یا مہنگی لیکن اس پہلو سے یہ اچھی رہے گی کہ ذہنی کا برقعہ اتار دینے کے سبب سے وہ اس کو آزادی اور جرأت کے ساتھ لڑ سکیں گی۔ ایک جنگ کی کامیابی کی غالب توقع اسی شکل میں ہوتی ہے جب وہ آزادی اور جرأت کے ساتھ لڑی جائے نہ کہ دو دلی کے ساتھ۔

اور اگر وہ ان حقوق کی طالب ہیں جو اسلام نے ان کو بخشے ہیں تو ان کا یہ مطالبہ سر آنکھوں پر۔ اس ملک کا ہر مسلمان اس مطالبہ میں ان کے ساتھ ہے۔ وہ شوق سے اپنا ایک ایک حق وصول کریں اور قانون کے زور سے حاصل کریں۔ یہ حکومت اگر ان کے یہ سارے حقوق ان کو نہ دلوا سکی تو یہ ایک اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ اس چیز کے لیے ان شاء اللہ ان کو یہاں کوئی لڑائی نہیں لڑنی پڑے گی۔ بلکہ یہ ان کو آپ سے آپ حاصل ہو گی بشرطیکہ اس ملک کا معاشرتی و سماجی ارتقا انہی خطوط پر ہو جو دستور میں طے کر دیے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہیں کوئی الگ محاذ گرم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کوششوں کو تقویت پہنچانی چاہیے جو اس ملک میں صحیح اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے جاری ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان اسلامی حقوق کے مقابل میں جو ذمہ داریاں اسلام نے ان پر ڈالی ہیں وہ بھی خوشی سے وہ اٹھانے کے لیے تیار رہیں۔ وہ اگر اسلام کے نام پر حقوق مانگیں اور اسلام کی عائد کردہ ذمہ داریوں سے فرار اختیار کریں بلکہ کھلم کھلا ان کا مذاق اڑائیں تو کسی شخص کو بھی ان کے اسلام کا نام لینے سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ آپ کے جذبات سب سے زیادہ برانگیختہ تعدد ازدواج کے خلاف ہیں۔ لیکن آپ صرف اسی تعدد ازدواج کے خلاف کیوں ہیں جس کی مثال کہیں اکا دکا آپ کے معاشرے میں ملتی ہے؟ اس تعدد ازدواج کے خلاف آپ کی غیرتِ نسوانی جوش میں کیوں نہیں آتی جس کی مثالیں نئی تہذیب

کی بدولت آپ کو ہر محفل، ہر دعوت، ہر ڈنر، ہر پکنک، ہر مخلوط کالج اور ہر دفتر میں مل سکتی ہیں اور اگر سینماؤں نائٹ کلبوں اور عیاشی کے دوسرے اڈوں کا بھی اس فہرست میں اضافہ کر لیجیے تب تو پھر کوئی حد ہی اس کی باقی نہیں رہ جاتی۔ آخر جو بہنیں ایک سوکن کے تصور سے بھی چیں بجبیں ہوتی ہیں وہ اس پہلو پر کیوں نہیں غور کرتیں کہ مغربی تہذیب نے عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کی جو راہ کھولی ہے اسکی بدولت آج مغرب زدہ سوسائٹی کی شاید ہی کوئی ایسی خوش قسمت عورت ہو جس کے شوہر کے دل اور مال دونوں میں ان گنت سوکنیں شریک نہ ہوں۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ مغربی تہذیب نے اگر یہ آزادی مردوں کو دی ہے تو یہی آزادی عورتوں کو بھی بخشی ہے اور جب دونوں فریق کو مساوات حاصل ہے تو اس امر میں کسی کو کسی سے شکایت کا حق نہیں ہے۔ لیکن میرے لیے یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہے کیونکہ اگر فی الواقع سوکن کوئی خلافِ فطرت اور خلافِ عقل شے ہے تو پھر ہر شکل اس کو رد کیجیے ورنہ یہ تو کوئی معقول بات نہ ہوئی کہ ایک چیز اس وقت تک تو برائی ہے جب تک اس کا مرتکب صرف ایک فریق ہے جب دونوں فریق اس کو دھڑلے سے کرنے لگیں تو وہ نیکی بن جائے۔

سنت کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا موقف

(۲)

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو ترجمان ذی القعدہ ۱۳۸۵ھ)

اقسامِ حدیث میں سے متواتر اور مشہور کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ذیل میں خبرِ واحد کے بارے میں اُن کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔

خبر واحد کی تعریف خبر واحد ـــــ یا امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے ہم عصر فقہا کی اصطلاح میں "خبر خاصہ" اُس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ایک یا دو یا دو سے زائد ہوں اور اُس میں مشہور حدیث کی شرائط میں سے کوئی شرط نہ پائی جاتی ہو۔ خبرِ واحد کی سند کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہونا ظنِ غالب کی بنا پر ہوتا ہے نہ کہ یقینی علم کی بنا پر، جیسا کہ اوپر متواتر اور مشہور کی بحث میں گذر چکا ہے۔ اسی لیے علمائے فقہ خبرِ واحد کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اس کی سند کا اتصال کے ساتھ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچنا قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا ہے۔ کشف الاسرار کے مصنف نے لکھا ہے کہ خبرِ واحد کے اتصال میں ظاہری اور معنوی دونوں پہلوؤں سے اشتباہ کی گنجائش موجود ہے۔ ظاہری لحاظ سے اشتباہ کا احتمال اس بنا پر ہوتا ہے کہ جس قطعیت کے ساتھ متواتر اور مشہور حدیث کا سلسلۂ اسناد آں حضور تک پہونچتا ہے خبرِ واحد کے بارے میں ویسی قطعیت اور صحت کا ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ معنوی طور پر اس احتمال کی دلیل یہ ہے کہ خبرِ واحد کو امت کے اندر قبولیتِ عامہ کا وہ شرف حاصل نہیں ہوا جو متواتر اور مشہور کو حاصل ہے ....

خبرِ واحد میں رُواۃ کی تعداد کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ جب تک وہ تواتر اور شہرت کے درجے سے فروتر ہے اور اُن کی شرائط و علامات سے خالی ہے وہ بہرحال خبرِ واحد ہی شمار ہوگی، خواہ اس کے راویوں کی تعداد

ایک سے زائد ہو......." [1]

دورِ اجتہاد میں خبرِ واحد کے منکرین عہدِ صحابہ اور عہدِ تابعین کے بعد جب تبع تابعین کا دور آیا جسے ہم دورِ اجتہاد کے نام سے یاد کرتے ہیں، تو بعض ایسے لوگ بھی نمودار ہوئے جنہوں نے خبرِ واحد کو دین میں حجت اور ماخذِ شریعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں کے انکار کی بنیاد دراصل اسی مذکورہ بالا شبہ پر قائم تھی جو خبرِ واحد کے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہونے میں کسی نہ کسی حد تک پایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دو اور اسباب بھی ایسے تھے جنہوں نے ان کے انکار و جحود کو مزید تقویت پہونچائی۔ اُن میں سے پہلا سبب یہ تھا کہ اُس وقت وضعِ حدیث کا فتنہ نہایت زور پکڑ چکا تھا۔ اور فتنہ جُو عناصر کثرت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی اور خود ساختہ احادیث منسوب کر رہے تھے (جس سے حدیث کے بارے میں لوگوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے) اور دوسرا سبب یہ تھا کہ احادیث کا ذخیرہ ابھی تک خلط ملط تھا۔ صحیح اور غیر صحیح احادیث میں تحقیق و تمیز اور چھان بین کا کام ابھی باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوا تھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے "جماع العلم" میں لکھا ہے کہ یہ لوگ (خبرِ واحد کے منکرین) بصرہ میں رہتے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ اُن کے مناظرے بھی ہوئے ہیں۔ بصرہ شروع ہی سے نہ صرف معتزلہ کا گڑھ تھا بلکہ دوسرے مختلف مذاہب کے پیرؤں اور مختلف فرقوں کی بھی آماج گاہ بنا ہوا تھا، جہاں مناظروں اور مجادلوں کا ہر وقت بازار گرم رہتا تھا۔ اس لیے لازماً خبرِ واحد کے منکرین امام شافعی رحمہ اللہ سے پہلے یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں بھی وہاں موجود ہوں گے۔ اس قیاس کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ احادیث میں شکوک و شبہات کے جو اسباب امام شافعی رحمہ اللہ کے زمانے میں پائے جاتے تھے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے زمانے میں اس سے زیادہ کثرت اور شدت کے ساتھ موجود تھے۔ اس وقت تک صحیح احادیث کو غیر صحیح احادیث سے ممیز کرنے کا کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ ذاتِ رسولؐ پر افترا پردازی اور جھوٹی روایات کا انتساب وسیع پیمانے پر ہو رہا تھا۔ اقوال و روایات میں اختلاف و اضطراب شدت کے ساتھ پایا جاتا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ احادیث کے نقد و جرح کے ضوابط، جو بعد میں علماء حدیث نے

[1] کشف الاسرار۔ از امام فخر الاسلام بزدوی ص ۹۹

مدوّن کیے، اُس وقت تک وضع نہیں کیے گئے تھے اور نہ ہی صحیح احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب ہوا تھا۔ ایک طرف تو یہ ابتدائی امور بھی طے نہیں پائے تھے اور دوسری طرف یہ حالت تھی کہ ہوا پرست رنگا رنگ کے بھیس بدل کر اور گوناگوں مذاہب کا لبادہ اوڑھ کر فتنہ پردازیاں کر رہے تھے اور ہر گروہ اپنی دُھن میں مست اور اپنے مسلک میں مگن ہو کر میدان میں اُترا ہوا تھا (كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝) اس خلفشار اور غوغا آرائی میں امت کی پناہ گاہ صرف فقہاء اور محدثین کا طبقہ تھا اور جمہور مسلمین کو اپنی نجات اور اطمینان و سکون کا سامان اگر کہیں میسر آسکتا تھا تو انہی حضرات کے توسط سے آسکتا تھا اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فقہاء و محدثین ہی کی جاں فشانیاں تھیں جو اس تیرہ و تار شب میں حق کو باطل سے چھان پھٹک کرامت کے لیے روشنی مہیا کر رہی تھیں۔

خبرِ واحد عملی احکام کا ماخذ ہے اسی انتشار اور کثرتِ اتہام طرازی کو مدِّ نظر رکھ کر جمہور فقہاء نے یہ رائے قائم کی کہ عقائد و ایمانیات کے بجائے اسے صرف عملی احکام کا ماخذ بنایا جائے اور عقائد و ایمانیات کے استثنیٰ کی وجہ یہ ٹھیرائی گئی کہ دین کے اس حصے کی بنیاد ایسے دلائل و براہین پر رکھی جا سکتی ہے جو ہر لحاظ سے یقینی اور قطعی الصحت ہوں اور ان میں کسی پہلو سے غلطی اور اشتباہ کا دخل نہ ہو۔ عقیدہ کہتے ہی اُس یقینی علم کو ہیں جو ٹھوس قطعی اور یقینی دلائل سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح کا حتمی علم ایسی دلیل سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا جس میں شک و شبہ کی آمیزش ہو یا اس کی قطعیت کسی طور سے بھی مجروح ہوتی ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ عملی پہلو کے لیے اس قطعیت اور تیقن کو کیوں لازم نہیں قرار دیا جاتا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عمل کا دار و مدار خبر (روایت) میں صدق و کذب کے دو مساوی پہلوؤں میں سے جانبِ صدق کی طرف رجحان پر ہوتا ہے۔ صدق کی جانب ترجیحِ محض کے لیے صرف یہی کافی ہوتا ہے کہ اگر خبر میں کسی مخالف دلیل سے احتمالِ کذب پیدا ہو رہا ہو تو اُس کی نفی ہو جائے۔ مطلق احتمال کی نفی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر اگر راوی (خبر دینے والا) عادل اور ثقہ ہو تو وہ خبر کی صحت اور صداقت کے پہلو کو اُس کی عدمِ صحت و صداقت کے پہلو پر غالب و فائق کر دیتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اگر ایک طرف منفی پہلو سے احتمالِ کذب پیدا کرنے والی کوئی مخالفانہ دلیل نہ ہو اور دوسری طرف مثبت طور پر راوی کی عدالت و ثقاہت احتمالِ صدق کی تائید و تقویت کر رہی ہو تو ایسی صورت میں خبر کو قبول کیا

خبر واحد کو صرف ثقہ اور عادل راویوں سے قبول کیا جائے اور

جاتا ہے اور اس کے مقتضیات پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ یہ ضابطہ صرف روایتِ حدیث ہی سے مختص نہیں بلکہ یہ انسانی فطرت کا ایک عمومی تقاضا بھی ہے۔ عامۃ الناس اپنے باہمی نزاعات کے تصفیہ میں، لین دین کے روزانہ کے معاملات میں اور زندگی کے عام کاروبار و مشاغل میں طبعاً اسی اصول پر چلتے ہیں۔ اگر زندگی کے عام معاملات و مسائل کی استواری شکوک و شبہات سے مبرا اور یقینی دلائل کے ساتھ مشروط کر دی جائے اور کوئی کام یا کوئی کلام اُس وقت تک صحیح نہ تسلیم کیا جائے جب تک اُس کی صحت کے لیے ناقابلِ اشتباہ اور قطعی ثبوت فراہم نہ ہو تو اس طرح انسانی زندگی کی گاڑی کا ایک دن کے لیے بھی چلنا محال ہو جائے گا، تمام کاروبار ٹھپ ہو جائیں گے اور کسی غلط چیز کا ازالہ ہو سکے گا نہ کسی صحیح چیز کا اثبات ممکن رہے گا۔

امام ابوحنیفہؒ خبرِ واحد کو تسلیم کرتے تھے

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اُن فقہا کی صفِ اول میں پائے جاتے ہیں جنہوں نے خبرِ واحد کو قبول کیا ہے۔ شریعت کے احکام و مسائل میں اُسے سند و حجت تصور کیا ہے اور اپنے قیاس اور رائے پر اُسے مقدم و مرجح ٹھیرایا ہے۔ امام موصوف کا یہ طریقہ تھا کہ انہیں اگر کوئی ایسی حدیث مل جاتی جو اُن کے قائم کردہ قیاس سے متصادم ہوتی تو بلا تامل قیاس سے دست بردار ہو جاتے اور مقتضائے حدیث پر عمل کرتے۔ ہم پیچھے کسی باب میں بیان کر چکے ہیں کہ امام صاحب کو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ معلوم ہوا کہ غلام کا کسی محارب کافر کو امان دینا آزاد کے امان دینے کے حکم میں ہے تو انہوں نے اپنی پہلی رائے سے (جو خلیفہ ثانی کے فتوے کے خلاف پڑتی تھی) رجوع کر لیا۔ اور فتوی کو اپنے مسلک کا ماخذ قرار دے لیا۔ جب ایک صحابی کے فتوی کی اہمیت و فوقیت اُن کی نگاہ میں اس قدر تھی کہ طریقِ آحاد سے مروی ہونے کے باوجود، وہ اُسے بے دریغ قبول کر لیتے تھے اور اس کے مقابلے میں اپنے قیاس کو ساقط کر دیتے تھے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سندِ آحاد سے مروی ہونے والی احادیثِ نبوی کو وہ کس قدر بدرجۂ اولیٰ قبول کرتے ہوں گے! چنانچہ اُن کے اخذ بالحدیث اور عمل بالحدیث کے ثبوت میں بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں، مگر یہاں اُن کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ امام ابو یوسف کی کتاب (الآثار) اور امام محمد کی کتاب الآثار اٹھا کر دیکھ لیں۔ ان دونوں کتابوں پر ایک طائرانہ نگاہ ہی سے آپ جان جائیں گے کہ امام ابوحنیفہ کس درجہ مستعدی اور دلی آمادگی سے خبرِ احد کو تسلیم کرتے تھے، اُسے دوسروں تک روایت کرتے تھے، اپنے فقہ و اجتہاد کا

ماخذ و مبنیٰ ٹھیراتے تھے' اس کے احکام کو مسائل کی علل کا استخراج کرتے تھے' اور قیاس کی موزونیت و استواری اور مصلحت عامہ کے ہم آہنگ رہنے کی حد تک اُن پر نئے مسائل کا استنباط کرتے تھے۔ ان تمام تفصیلات کو معلوم کرنے کے لیے مذکورۃ الصدر دونوں کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ جہاں تک ان کتابوں کی صاحبین کی طرف نسبت کا تعلق ہے' اس کی صحت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ کے تلامذہ کا مسلک چونکہ امام صاحب خبر واحد کے بارے میں اپنے موقف کو ہمیشہ شاگردوں کے سامنے واضح کرتے رہتے تھے' اس لیے آپ کے شاگردوں کا بھی وہی مسلک رہا ہے جو آپ کا ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر شاگرد' ان کے مذہب کے صحیح ترجمان اور حنفی مدرسۂ فکر کی حقیقی تصویر کشی کرنے والے ہیں۔ فقہ حنفی کے قواعد و ضوابط سے جو شخص بھی واقفیت اور لگاؤ رکھتا ہے وہ مذہب حنفی میں ان کے مقام کو بخوبی پہچانتا ہے۔ امام محمد نے اپنی کتاب "الاصل" میں صحیح آثار و اقوال سے شرح و بسط کے ساتھ ایسے دلائل پیش کیے ہیں جن سے خبر واحد کی حجیت کا اثبات ہوتا ہے۔

اسی طرح انہوں نے احادیث رسول اور آثار صحابہ سے بے شمار واقعات نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ خود صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز عمل بھی یہی تھا کہ وہ خبر واحد کو تسلیم کرتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے اس فعل (قبول روایت اور اسے معمول بہ بنانے) کی تغلیط کرنے کے بجائے اُسے برقرار رکھتے تھے۔ آپؐ کی وفات کے بعد بھی صحابہ کا یہی شیوہ رہا۔ اُن میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس نے منفرد راوی کی روایت کو تسلیم کرنے میں چون و چرا کی ہو۔ اتنی بات ضرور تھی کہ بعض صحابہ کبھی کبھی احتیاط کے پیش نظر ایک راوی کی دوسرے شخص سے تصدیق و توثیق کروالیتے تھے' یا اصل راوی سے حلف لے کر اپنا وثوق اور اعتماد حاصل کر لیتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہیں قبول روایت میں پس و پیش تھا یا اس میں شک و شبہ ہوتا تھا بلکہ اُن کا یہ طریقہ محض اطمینان اور احتیاط کے پہلو سے تھا۔

امام محمد رحمہ اللہ نے "الاصل" میں استحسان کے باب میں ایسے تمام واقعات کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔

خبرِ واحد کے بارے میں صحابہ کا طرزِ عمل

ذیل میں ہم آپ کے سامنے "الاصل" کے بعض اقتباسات نقل کرتے ہیں جو اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں کہ فقہ حنفی میں اخبار آحاد پر کہاں تک اور کس حد تک اعتماد اور تمسک کیا جاتا ہے۔

۱۔ امام محمد نے دادی کی توریث کے بارے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث[1] کو بیان کیا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے شہادت دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو سُدس (چھٹے حصہ) کا حق دار بنایا ہے۔ خلیفۂ اول نے پوچھا کہ کوئی اور بھی اس کا شاہد ہے؟ چنانچہ محمد بن مسلمہ نے بھی اس کی تائید کی۔ تب حضرت ابوبکر نے اسے نافذ کر دیا۔ یہ خالص دین کا معاملہ تھا۔ حضرت ابوبکر نے اس میں خبرِ واحد کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کیا ہے۔ دوسرے راوی کو بطور شاہد طلب کرنا صرف مزید توثیق و تائید کے لیے تھا۔

۲۔ ایک روایت میں[2] ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ابوموسیٰ اشعری نے حدیث

---

[1] پوری روایت یہ ہے کہ ایک بار ایک متوفی کی دادی ابوبکر الصدیق کے پاس آئی کہ اسے بھی ورثہ میں سے کچھ ملنا چاہیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "کتاب اللہ میں تیرا حصہ مقرر نہیں کیا گیا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حصے کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا ہے یا نہیں؟" پھر حضرت ابوبکر نے دوسرے لوگوں سے پوچھا کہ "کیا تم میں سے کسی نے رسولِ خدا کو دادی کے حقِ وراثت کے بارے میں کچھ فرماتے سُنا ہے؟" مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا: "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو میت کے ترکہ میں سے چھٹے حصہ کا حق دار بنایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا کہ کوئی اور بھی اس کا شاہد ہے؟" محمد بن سلمہؓ نے بھی یہی شہادت دی۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو پوتے کے مال میں سے چھٹا حصہ دے دیا۔ [2] جریری نے نضرہ سے اور انہوں نے حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے کے باہر انہیں تین بار (بلانے کے لیے) اسلام کہا، لیکن جب آپ نے کچھ جواب نہ دیا تو واپس لوٹ آئے۔ حضرت عمرؓ نے آدمی بھیج کر ابوموسیٰ کو بلوایا اور لوٹ جانے کی وجہ پوچھی۔ حضرت ابوموسیٰ نے کہا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے کہ: "اذا استأذن احدکم فلم یؤذن لہ فلیرجع"۔ حضرت عمرؓ نے کہا: "اس پر کوئی اور گواہ پیش کرو، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔" راوی کہتا ہے کہ ابوموسیٰؓ گھبراہٹ کے عالم میں ہمارے پاس آئے

بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی دروازے پر تین آوازیں دے اور اس کے باوجود اُسے اجازت نہ ملے تو واپس چلا آئے"۔ حضرت عمرؓ نے سن کر فرمایا: اس پر کوئی گواہ لاؤ"۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت کی توثیق کی۔

امام محمد ان دونوں روایتوں کی نسبت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے طلب شہادت کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شیخین کا دوسرے راوی کو شہادت کے لیے طلب کرنا محض تثبت اور احتیاط کی خاطر تھا ورنہ ان کے لیے ایک راوی کا بیان ہی کافی تھا۔

۳۔ امور دین میں خبر واحد کو قبول کرنے کے ثبوت میں امام محمد نے حضرت عمرؓ کے ایک اور عمل سے استدلال کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عورت کو اپنے شوہر کی دیت میں وارث نہیں سمجھتے تھے لیکن جب ان کو ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ نے یہ خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن (ضحاک) کو لکھا تھا کہ "اشیم الضبابی کی بیوی اُس کی دیت میں وارث ہے"۔ تو حضرت عمرؓ نے ضحاکؓ کی روایت کو قبول کر لیا اور اپنی سابقہ رائے سے رجوع کر لیا۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل سے بھی مثال ملتی ہے۔ آپؐ نے دحیہ کلبیؓ کے ہاتھ قیصر روم کو خط بھیجا جس میں آپؐ نے قیصر روم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ امام محمدؒ لکھتے ہیں کہ یہ خط قیصر روم پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کی حیثیت رکھتا تھا۔ (حالانکہ اسے لے کر جانے والا (دحیہ کلبیؓ) فرد واحد تھا)۔ اسی ضمن میں امام محمد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ قبول حدیث کے بارے میں اپنے طرزِ عمل کو بیان کرتے ہیں کہ: جب میں کسی حدیث کو براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنتا تھا بلکہ کوئی دوسرا شخص میرے سامنے آپؐ کی حدیث بیان کرتا تو میں اس سے حلف لیتا تھا۔ حضرت ابوبکر نے مجھ سے حدیث بیان کی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ ہم نے پوچھا: کیا معاملہ درپیش ہے؟ انہوں نے پورا واقعہ بتایا۔ اور کہا کہ تم میں سے کسی نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے؟ ہم نے کہا "ہم میں سے ہر ایک نے سُنا ہے" پھر ایک صحابی اُن کے ساتھ گئے اور حضرت عمرؓ کو اس حدیث کی خبر دی۔ (مسلم)

انہوں نے جو کچھ فرمایا ٹھیک فرمایا۔ (اُن سے حلف لینے کی ضرورت نہیں)۔ امام محمد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد "مسئلہ یمین" کی تشریح کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ حلف لینے کے معاملے میں دوسرے تمام صحابہ سے منفرد تھے۔ حضرت علی کی عام عادت تھی کہ گواہ سے بھی حلف لیتے۔ مدعی سے بھی ثبوت کے ساتھ حلف لیتے۔ اپنی اسی عادت کی بنا پر حدیث بیان کرنے والے سے بھی حلف مانگا کرتے تھے۔ آپ کے اس مسلک سے یہ نتیجہ ماخوذ ہوتا ہے کہ گویا آپ اس امر کے قائل تھے کہ راوی جب کسی حدیث کو روایت کرتا ہے اور اس کے ساتھ اپنا حلفیہ بیان بھی دے دیتا ہے تو اس کی روایت مزکّٰی (کذب و غلطی کی آلائش سے پاک) ہو جاتی ہے۔ اس کی صورت بعینہ وہی ہوتی ہے جو لعان کے مسئلے میں فریقین (عورت اور شوہر) کی طرف سے شہادتیں ادا کرنے کی ہوتی ہے جو مُخبر معصوم من الکذب نہیں ہے (اور انبیاء کے علاوہ کوئی انسان کذب سے معصوم نہیں ہے) انفرادی حیثیت میں اس کی خبر اُس وقت تک حجیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ وہ حلف کے ذریعہ روایت کو تہمتِ کذب کے شائبہ سے نہیں دھو دیتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اس شرط کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ وہ قسم دینے سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی کی بارگاہِ اقدس سے حضرت ابوبکر کا الصّدیق کے لقب سے نوازا جانا اس امر کے لیے کافی ہے کہ اُن کی روایت وخبر مُزکّٰی اور آلائشِ کذب کے احتمال سے پاک ہے۔

اس قبیل کے اقوال و آثار کا معتدبہ ذخیرہ امام محمد نے اپنے دعویٰ کے اثبات میں نقل کیا ہے، جس میں سے چند آثار بطور نمونہ ہم نے آپ کے سامنے بیان کر دیے ہیں۔ امام محمد نے ان دلائل و شواہد سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خبرِ واحد امورِ دین میں مقبول و مسلّم ہے۔ رویتِ ہلال کے سلسلے میں شخصِ واحد کی خبر پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ کسی شے کے بارے میں تحلیل و تحریم کا فیصلہ منفرد شخص کی اطلاع کے بموجب کیا جا سکتا ہے چنانچہ فقہ حنفی میں یہ امور مسلّمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امام صاحب کی طرف سے اسی فقہی نظریے کا شاگردوں کو املا کرانا منقول ہے۔ اور اس پر امام صاحب کے اصحاب اور تلامذہ کی موافقت و ہم آہنگی کی شہادت بھی موجود ہے۔ اب غور کیجیے کہ جب امام صاحب کے مسلک میں تحلیل و تحریم جیسے دین کے اہم مسائل میں عام انسانوں کی منفرد خبر اور روایت کو درجۂ قبولیت حاصل ہے تو یہ بات عقل و فہم سے بالاتر ہے

کہ وہ اپنے استنباط و اجتہاد کے مقابلہ میں خبر واحد کو غیر مقبول اور ناقابلِ تسلیم گردانتے ہوں گے (اور اُسے مسترد کر کے اپنے قیاسی مسائل پر جمے رہتے ہوں گے)، خصوصاً جب کہ اس کی سند بھی ایک ہی واسطے پر نہیں بلکہ متعدد واسطوں پر مشتمل ہو۔!!

فقہ حنفی کے فروعات اور کلیات سے صاف مستنبط ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے احادیثِ آحاد کو بھی شرعی مآخذ کی فہرست میں رکھا ہے۔ اور اپنے فقہی قیاسات اور اجتہادی قواعد و ضوابط کی تدوین میں اُن پر استناد کیا ہے۔ اس سلسلے میں جمہور فقہا اور محدثین کی طرح حنفیہ کے ہاں بھی روایت و قبولیتِ حدیث کے شرائط معین ہیں۔ چنانچہ خود امام صاحب اور ان کے اصحاب اور بعد کے فقہائے حنفیہ نے راوی کے لیے عدالت اور ضبط (حفظ) کو شرطِ لازم قرار دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حفظ کے مفہوم کی تعیین اور تشریح میں حنفیہ دوسروں کی نسبت زیادہ تشدد کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ امام فخر الاسلام بزدوی نے کشف الاسرار میں مسلکِ حنفی کے مطابق ضبط کی تشریح یہ کی ہے:-

مسلکِ حنفی کے مطابق ضبط کی تعریف

ضبط کی تعریف یہ ہے کہ راوی حدیث کو اپنے کانوں سے ـــ پورے انہماک کے ساتھ ـ سنے، اُس کی مراد و منشا کو سمجھے، محنت اور کوشش سے اُسے یاد رکھے اور پھر روایت کرنے کے وقت تک تمام عرصہ میں اپنے حفظ اور یاد داشت کے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہوئے بغیر بار بار اہل علم سے مذاکرہ کرتا رہے۔ ضبط کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) متنِ حدیث کے الفاظ و کلمات کو اور اس کے لغوی معنی کو محفوظ رکھنا۔ (۲) اس کے ساتھ ساتھ حدیث کے شرعی اور فقہی منشا ..... کو یاد رکھنا۔ (یعنی یہ شعور رکھنا کہ قانونی احکام اور فقہی مسائل حدیث سے کیسے مستنبط کیے جا سکتے ہیں اور حدیث کا موقع و محل کیا تھا) ضبط کی دوسری قسم پہلی سے زیادہ جامع اور اکمل ہے۔ مطلق اور عام ضبط کا اطلاق پہلی قسم پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس راوی پر پیدائشی طور نسیان و ذہول کا غلبہ ہو یا روایت کے بیان کرنے میں بے احتیاطی اور ظن و تخمین کا عادی ہو اس کی روایت قابل حجت نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ اس کے اندر ضبط کی وہ شرائط مفقود ہیں جو قسم اول میں بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح فقیہ راوی کی روایت جب غیر فقیہ راوی سے متعارض ہو جائے گی ....

...... تو اول الذکر کی روایت کو موخر الذکر کی روایت پر ترجیح دی جائے گی۔ (اس بنا پر کہ اول الذکر راوی میں ضبط کی زیادہ کامل اور جامع شرائط موجود ہیں) [۱]

اصول بزدوی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ ضبط کی تعریف و تشریح میں تشدد اور غلو کی طرف مائل ہیں اور اُن کے نزدیک ضبط کا مفہوم اس وقت کامل و جامع ہوتا ہے جب کہ راوی میں تفقہ کی صفت بھی پائی جاتی ہو۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ وہ راوی کے تفقہ کو ترجیح روایت کی اساس تو قرار دیتے ہیں مگر اُسے قبولِ روایت کی شرط نہیں ٹھیراتے۔ مثلاً جب دو (سند کے اعتبار سے ہم پلہ حدیثیں) باہم متعارض ہوں ان میں سے ایک کا راوی فقیہ ہو اور دوسری غیر فقیہ راوی سے پہونچ رہی ہو تو احناف کے نزدیک (ضبط کامل کی شرائط سے متصف) پہلے شخص کی روایت مقدم و مرجح اور واجب العمل ہوگی۔ تفقہ کو اساس ترجیح شمار کرنے کا سبب یہ ہے کہ جو راوی سرمایۂ تفقہ سے بہرہ ور ہوتا ہے وہ ضبطِ حدیث میں اور تحقیق و تجسس میں دوسروں سے فائق ہوتا ہے اور دین کے فہم و تدبر میں بھی وہ دوسروں پر سبقت لے جاتا ہے

ترجیح فقیہ کے باب میں امام صاحب کی تصریح

راوی کے تفقہ کی بنیاد پر روایت کو ترجیح دینے کی تصریح خود امام ابوحنیفہ کی اپنی زبان سے منقول ہے، جو کہ امام صاحب نے امام اوزاعی رحمہ اللہ کے ساتھ اپنی ایک مناظرانہ گفتگو میں کی ہے۔ اس مناظرے کی پوری روداد کو حضرت سفیان بن عیینہؒ نے روایت کیا ہے کہ "ایک بار امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کی دارالخیاطین، مکہ میں ملاقات ہوئی۔ اثنائے گفتگو امام اوزاعی نے امام ابوحنیفہ سے پوچھا:

"تم (اہلِ عراق) رکوع میں جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟

امام ابوحنیفہ نے جواب دیا:

"کیونکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے کہ آپؐ تکبیرِ اولیٰ کے علاوہ رکوع جاتے اور رکوع سے اٹھنے کے وقت بھی رفع یدین کیا کرتے تھے؟"

اوزاعی نے کہا:

کیوں کر ثابت نہیں ہے۔ مجھ سے زہری نے، زہری سے سالم نے اور سالم نے اپنے باپ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے

اور جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین فرماتے "۔

امام ابوحنیفہ نے جواب دیا:

ہم سے حماد نے، حماد سے ابراہیم نے، ابراہیم سے علقمہ اور اسود نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سند سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز شروع فرمانے کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اس کے بعد رکوع وغیرہ میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

امام اوزاعی نے کہا:

میں آپ کے سامنے زہری، سالم اور عبداللہ بن عمرؓ کی سند سے روایت بیان کر رہا ہوں اور آپ اس کے مقابلے میں حماد اور ابراہیم کا نام لیتے ہیں"۔

امام ابوحنیفہ نے کہا:

" حماد زہری سے زیادہ اور ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ کو اگرچہ صحبتِ رسول کا شرف حاصل ہے تاہم علقمہ اُن سے کم نہیں ہیں۔ اسود کو بھی بہت سی فضیلتیں حاصل ہیں"۔

ایک دوسری روایت میں آخر کے الفاظ یوں ہیں کہ " ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر صحبتِ رسول کی فضیلت کا سوال نہ ہوتا (جو عبداللہ بن عمرؓ کو حاصل ہے) تو میں کہتا کہ علقمہ کا درجۂ فقاہت عبداللہ بن عمر سے اونچا ہے رہے عبداللہ بن مسعود تو وہ عبداللہ بن مسعود ہی ہیں [1]۔ یعنی ان کے مرتبہ تک مذکورہ اصحاب میں سے کسی کی رسائی نہیں۔

اس مناظرے سے یہ امر صاف واضح ہوتا ہے کہ امام صاحب ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دیتے وقت راوی کے تفقہ اور اجتہادی معیار کو ملحوظ رکھتے تھے اور درجۂ کم فقیہ کی روایت ترک کر کے زیادہ فقیہ کی روایت کو اختیار کرتے تھے۔ اس ترجیح کی وجہ ظاہر ہے کہ جو راوی تفقہ میں جس قدر زیادہ بہرہ رکھتا ہو گا وہ اسی قدر یادداشت اور ضبط میں زیادہ پختہ اور فہم و ادراک میں

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ از امام شاہ ولی اللہ دہلوی جلد اول ص ۳۳۱

زیادہ کامل ہوگا۔

دوسری بات جو امام اوزاعی اور امام ابو حنیفہ کی گفتگو سے متبادر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر فقیہ انہی محدّثین کی حمایت کرتا تھا جن کا شاگرد ہوتا تھا اور جن سے روایت کرتا تھا۔ یہ چیز علاقائی عصبیت کی پیداوار تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر علاقے کے علماء انہی احادیث کو لیتے تھے جن کے رُواۃ اُس علاقے کے صحابہ کے شاگرد ہوتے تھے۔

امام صاحب کے نکتہ چینوں کو شمس الائمہ سرخسی کا جواب

شمس الائمہ سرخسی نے امام ابو حنیفہ کے قلتِ روایت کی یہ توجیہ کی ہے کہ امام صاحب ایک تو راوی کے ضبط و حفظ کی شرط میں انتہائی سختی کرتے تھے اور اس بنا پر بہت کم روایات اُن کے معیار پر اُترتی تھیں۔ اور دوسرے وہ تقلیلِ روایت میں سلف کے نقشِ قدم پر چلتے تھے کیونکہ ان کی اکثریت بھی قلیل الروایت ہی تھی۔ شمس الائمہ لکھتے ہیں کہ: "ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بہت کم احادیث مروی ہیں۔ حتی کہ بعض نکتہ چینوں کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ امام صاحب حدیث سے نا آشنا تھے۔ ان لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ امام صاحب اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالمِ حدیث تھے۔ چونکہ وہ راوی میں کمالِ ضبط کی شرط کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے اس لیے اُن کی طرف سے بہت کم احادیث منقول ہیں[1]"۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام صاحب خبرِ آحاد کو قبول کرتے تھے، بلکہ اُس کے قبول کرنے میں انہیں کسی طرح کا تردّد نہ ہوتا، البتہ راوی کے ضبط میں متشدد تھے۔ جیسا کہ خود فقہائے حنفیہ کا بھی خیال ہے ——— اور جب مختلف روایات میں تعارض ہو جاتا تو رُواۃ کے تفقہ اور اجتہادی صلاحیت کو دیکھتے۔ جو راوی محض روایت گو ہوتا اس پر فقیہ راوی کو ترجیح دیتے۔ اور اگر دونوں راوی فقیہانہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوتے تو اُن میں سے جو نسبتہً زیادہ فقیہ ہوتا اُس کی روایت کو مقدم گردانتے۔

(باقی)

[1] کشف الاسرار جلد دوم ص ۲۱۵

رسائل و مسائل

جماعتِ اسلامی اور طریقِ انتخاب

سوال:- مجھے آپ کی خدمت میں ایک وضاحت پیش کرنا ہے۔ میں نے کچھ عرصہ قبل اپنی ذاتی حیثیت میں تجربۃً دس سالوں کے لیے مخلوط انتخاب کی حمایت کی تھی۔ اپنے حق میں دلائل دینے کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا تھا کہ مخلوط انتخاب کی مخالفت میں سب سے اونچی آواز جماعتِ اسلامی کی طرف سے اٹھائی جارہی ہے۔ پھر میں نے کم و بیش مندرجہ ذیل الفاظ کہے تھے "جماعتِ اسلامی میں ایسے لوگ ہیں جن کے لیے میرے قلب و جگر میں انتہائی احترام و عقیدت کا سرمایہ ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت نے پاکستان کے لیے جدوجہد نہیں کی تھی اور اگر ہندستان تقسیم نہ ہوتا تو کیا اس صورت میں متحدہ ہندستان میں جماعت اسلامی جداگانہ انتخابات کے حق میں آواز بلند کرتی؟" اس کے بعد جماعت کے بعض دوستوں نے مجھ سے گلہ کیا۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ میں ایک دلیل تعمیر کر رہا تھا جس سے مقصود جماعتِ اسلامی پر حملہ کرنا نہیں تھا بلکہ اپنے نقطۂ نگاہ کے جواز میں وزن پیدا کرنا تھا۔ میں نے آپ کی خدمت میں بھی اس صراحت کو پیش کرنا ضروری سمجھا تاکہ غلط فہمی رفع ہوجائے۔"

جواب:- میں نے اخبارات میں آپ کی تقریر کی رپورٹ تو پڑھی تھی لیکن میرے دل میں کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس سے بہت زیادہ باتیں دوسرے کہتے اور لکھتے رہے ہیں اور مجھے کبھی کسی سے کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔ اس لیے آپ کی وضاحت میرے لیے تو غیر ضروری ہی تھی۔ تاہم میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے بطورِ خود اس کی ضرورت محسوس کی۔

البتہ مخلوط انتخاب کے حق میں استدلال کرتے ہوئے جو بات آپ نے جماعتِ اسلامی کے بارے

میں کہی ہے وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلے بھی جماعت کی پوزیشن سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اب بھی آپ اسے صحیح طور پر نہیں سمجھتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں جماعت کی عدم شرکت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جماعت تقسیم کی مخالف تھی یا متحدہ ہندستان کی حامی تھی، ایک بہت ہی غلط استنتاج ہے۔ اگر آپ میری اُس زمانے کی تحریریں تفصیل کے ساتھ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو کہ میں اُس رہنمائی اور اُس طریق کار سے غیر مطمئن تھا جو مسلمانوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک طرف مسلم نیشلسٹ گروہ اور دوسری طرف نیشلسٹ مسلم گروہ پیش کر رہا تھا۔ دونوں کے متعلق میرے اُس وقت کے جو اندازے تھے بعد میں وہ لفظ بلفظ پورے ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اسی عدم اطمینان کی وجہ سے میں ان دونوں سے الگ رہا اور جو کچھ میرے نزدیک درست تھا اس کے لیے کام کرتا رہا۔ تقسیم ملک کی مخالفت اگر میں نے کسی روز کی ہو تو آپ اس کا حوالہ دیں۔ یا متحدہ قومیت یا متحدہ ہندستان کی تائید میں کبھی میں نے کوئی بات کہی ہو تو اس کی نشان دہی بھی آپ فرمادیں۔ ایسی کسی چیز کی غیر موجودگی میں مجھ سے یا جماعتِ اسلامی سے یہ سوال کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اگر ہندستان متحد رہتا تو کیا تم جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرتے۔

اس کے علاوہ اس معاملے میں ایک پہلو اور بھی ہے جسے آپ نظر انداز کر رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی نظامِ حکومت کے ساتھ کسی قسم کے تعاون یا اس میں کسی طرح کی حصہ داری کو جماعتِ اسلامی اصولاً غلط سمجھتی ہے۔ اسی وجہ سے تقسیم سے قبل کے انتخاب میں ہم نے سرے سے دلچسپی ہی نہیں لی۔ اگر خدانخواستہ ہندستان متحد رہتا اور اس میں سیکولر نظام قائم ہوتا تو اس کے لادینی نظامِ حکومت کے انتخابات میں حصہ لینے کے سرے سے ہم قائل ہی نہ ہوتے، پھر جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال اُس نظام میں ہمارے لیے کیسے پیدا ہوتا؟ جماعتِ اسلامی اس طرح کے لادینی نظام میں کام کرنے کا جو نقشہ اپنے سامنے رکھتی تھی اُسے جماعت کے لٹریچر میں وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا گیا تھا۔ آپ ہمارے اس طریق کار کو غلط سمجھنے اور کہنے کا حق رکھتے ہیں، مگر ہمارے حقیقی منشا کے خلاف ہماری باتوں کو یہ معنی پہنانا کہ ہم متحدہ ہندستان کے طالب اور تقسیم ملک کے مخالف تھے، ایک

ایسی زیادتی ہے جس کی ہم کم از کم آپ جیسے معقول آدمیوں سے توقع نہیں رکھتے۔

بیوی اور والدین کے حقوق

سوال: میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں جن سے ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئی ہیں لیکن ایک چیز جو پہلے بھی دل میں کھٹکتی تھی اور اب بھی کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاں عورتوں کا درجہ کافی بلند کیا ہے، وہاں بحیثیت بیوی کے بعض امور میں اس کو حقیر بھی کر دیا ہے۔ مثلاً اس پر تین تین سوکنوں کا جلاپا جائز کر دیا ہے، حالانکہ قدرت نے عورت کی فطرت میں حسد بھی رکھا ہے۔ اسی طرح جہاں بیوی کو شوہر کے قبضہ و اختیار میں رکھا گیا ہے، وہاں شوہر کو اپنے والدین کے قبضہ و اختیار میں کر دیا ہے۔ اس طرح شوہر والدین کے کہنے پر بیوی کی ایک جائز خواہش کو بھی پامال کر سکتا ہے۔ ان امور میں بظاہر بیوی کی حیثیت چار پیسے کی گڑیا سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ میں ایک عورت ہوں اور قدرتی طور پر عورت کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہوں۔ آپ براہ کرم اس بارے میں میری تشفی فرمائیں۔

جواب: آپ نے دو وجوہ کی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عورت کی پوزیشن خانگی زندگی میں فروتر رکھی گئی ہے۔ ایک یہ کہ مرد کو چار چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے۔ دوسرے یہ کہ شوہر کو والدین کا تابع رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات وہ اپنی بیوی کے جذبات اور اس کی خواہشات کو والدین کی رضا پر قربان کر دیتا ہے۔ ان وجوہ میں سے پہلی وجہ پر اگر آپ غور کریں تو یہ بات بہت آسانی کے ساتھ آپ کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ عورت کے لیے تین تین سوکنوں کا برداشت کرنا جتنا تکلیف دہ ہے، اس سے بدرجہا زیادہ تکلیف دہ چیز اس کے لیے یہ ہوسکتی ہے کہ اس کے شوہر کی کئی کئی محبوبائیں اور داشتائیں ہوں۔ اسلام نے اسی کو روکنے کے لیے مرد کو ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ ایک مرد ناجائز تعلقات میں جتنا بے باک ہوسکتا ہے، شادیاں رچانے میں اتنا نہیں ہوسکتا، کیونکہ شادی کی صورت میں مرد کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور طرح طرح کی پیچیدگیوں سے اسے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ دراصل عورتوں ہی کے فائدے کے لیے ایک روک تھام ہے، نہ کہ مردوں کے لیے بے جا رعایت۔ دوسرے طریقے کا

تجربہ آج کل مغرب کی سوسائٹی کر رہی ہے۔ وہاں ایک طرف تو جائز سوکنوں کا سدباب کر دیا گیا ہے لیکن دوسری طرف ناجائز سوکنوں سے عورت کو بچانے کا کوئی انتظام اس کے سوا نہیں کیا گیا کہ وہ انہیں برداشت نہ کر سکے تو شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لیے عدالت میں نالش کر دے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس سے عورت کی مصیبت کچھ کم ہوگئی ہے؟ چھڑی چھٹانک عورت تو شاید سوکن سے بچنے کے لیے طلاق کو آسان نسخہ سمجھ لے، مگر کیا بچوں والی عورت کے لیے بھی یہ نسخہ آسان ہے؟

دوسری جس شکایت کا اظہار آپ نے کیا ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ غالباً آپ ابھی تک صاحبِ اولاد نہیں ہیں، یا اگر ہیں تو آپ کے کسی لڑکے کی ابھی ... شادی نہیں ہوئی ہے۔ آپ اس خاص معاملے کو ابھی تک صرف بہو کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ جب آپ اپنے گھر میں خود بہو لے آئیں گی اور اس معاملے پر ماں کی حیثیت سے غور کریں گی تو یہ مسئلہ اچھی طرح آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ بیوی کے حقوق کتنے ہونے چاہییں اور ماں باپ کے کتنے۔ بلکہ اُس وقت شاید آپ خود اُنہی حقوق کی طالب ہوں گی جن پر آج آپ کو اعتراض ہے۔

شیعہ سُنّی تنازعات

سوال:۔ جماعتِ اسلامی پاکستان ایک نہایت عظیم اور بلند مقصد لے کر اٹھی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعتِ اسلامی کو کامیابی دے تاکہ پاکستان میں اسلامی دستور کا بول بالا ہو۔

جس چیز کی طرف ہم آپ کی توجہ مبذول کرا رہے ہیں وہ بھی اسلام کے لیے ایک نہایت ہی بنیادی چیز ہے۔ اور مقام افسوس ہے کہ آپ اور آپ کی جماعت نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اور اسی وجہ سے یہ معاملہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آپ خندہ پیشانی سے غور فرما کر جواب دیں گے۔

موجودہ دور کچھ اس قسم کا گذر رہا ہے کہ شیعہ فرقہ انتہائی طور پر منظم ہے اور وہ متفقہ طور پر ہر جگہ اپنی تقریروں، تحریروں اور پمفلٹوں کے ذریعہ صحابہ کرامؓ پر زہر اگل رہا ہے۔ جن میں اُن کے وزراء بھی

ہماری غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ اور ہمارے لیڈرانِ کرام اور علماء حضرات آپس کی کش مکش میں اسلام کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔

یہ لوگ مذہبی آزادی کی آڑ میں ہر جگہ نئے نئے لائسنس عزاداری لے کر اور اُن لائسنسوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کھلے بندوں علانیہ تبرا کر رہے ہیں۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو اُسے گورنمنٹ کی مخالفت کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس لائسنس ہوتے ہیں۔ گویا حکومت لائسنس کی آڑ میں تبرا کروا رہی ہے۔ اور لائسنسوں ہی کی وجہ سے گورنمنٹ خود ان کی نگہداشت کرتی ہے

حالات یہاں تک پہونچ گئے ہیں کہ اُن کا ہر فرد اپنے ... فرقہ کی ترقی کے لیے جائز و ناجائز طریقہ سے اپنے خاص عقائد کو پھیلانے کے لیے پوری جد و جہد سے کام لے رہا ہے۔ اور تمام شیعہ پریس بھی تبرا بازی پر مشتمل مضامین شائع کر رہا ہے اور ان کے علما ہر جگہ عزاداری کی آڑ لے کر "قتل حسین در سقیفہ" کے عنوان پر تقریریں کر رہے ہیں۔ ہمارے بے علم عوام ان کی تقریریں سُن سُن کر گمراہ ہو رہے ہیں اور شیعہ فرقہ سیلِ رواں کی طرح ملک کے مختلف حصوں میں پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

اب اس کے بعد ہماری حالت ہے کہ اگر کوئی مٹھی بھر علماء کی جماعت یا کوئی ادارہ ناموسِ صحابہؓ کی مدافعت کی خاطر میدانِ عمل میں نکلے تو اُس کا کام کچھ تو جماعتِ اسلامی کی تنقید کی نذر ہو جاتا ہے اور کچھ نقصان گورنمنٹ کی طرف سے بھی ہوتا ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کی مخالفت سے گورنمنٹ بھی یہ سمجھتی ہے کہ یہ ملا فرقہ وارانہ فساد کو ہوا دے رہے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ حضرات زبان بندیوں اور پابندیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ المنیر جلد ۸ شمارہ ۳۶؍ ۷، ار ستمبر سہ روزہ "دعوت" لاہور کی ضمانت طلبی پر صرف صحافت کے معیار کو قائم رکھتے ہوئے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور بعد میں اس طرح سے تنقید کرتا ہے کہ "یہ طریقہ کار اسلامی نقطۂ نظر سے ہمارے نزدیک زیادہ مفید نہیں ہے۔ اور ہمارا دینی مسلک اس موضوع میں معاصر سے مختلف ہے۔"

اتنے گندے ماحول میں آپ خود ہی اندازہ کریں کیا اس تنقید سے شیعہ پروپیگنڈے کی حوصلہ

افزائی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اپنے مضمون میں المنیر نے خود یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ "عزاداری تبرا بازی میں بدل چکی ہے"۔

ہم آپ سے مودبانہ سوال کرتے ہیں کہ ہمارے علماء کرام، سیاسی لیڈر، ادارے، اخبار اور خصوصاً آں جناب اور جماعتِ اسلامی کیوں خاموش ہیں۔ کیوں نہیں کوئی باہمی اور متفق صورت اختیار کی جاتی۔ کیا اسلامی قانون میں کوئی تبرا کرنے کی گنجائش ہے؟ اکثر مقامات اور خصوصاً نارووال میں عشرہ محرم میں کھلی جگہ پر تبرا بازی کی گئی ہے اور یہ نوحے بر سرِ عام لاؤڈ اسپیکر پر پڑھے گئے ہیں:۔

آقا کے چھوڑ جنازے کو کیوں بھاگے یار سقیفہ کو — کیوں چھوڑ دیا جنازے کو قرآن کے حافظ یاروں نے
کیوں یاروں نے من بعد نبی اُس گھر پر گستاخی کی — کیوں کھایا آلِ نبی کا حق قرآن کے دعوے داروں نے
جسکے گھر سے فیض اٹھا وہ اُسکے گھر نوں آگ لگا دن — کیوں دنیا حق تو بھل گئی اے، کیوں آلِ نبی دی رُل گئی اے
گئے یار سقیفہ جس دم کیا مشورہ مل کر باہم — کر دو اپنی حکومت مستحکم ....

وغیرہ وغیرہ۔ یہ نوحہ جات چھپے ہوئے ہیں۔

اس کی اطلاع جب بروقت ایس ڈی او صاحب اور ڈی ایس صاحب کو دی تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ ہم اپنی ڈائری میں لکھ رہے ہیں' ان کے پاس لائسنس عزاداری ہے' ہمیں قصوروار ٹھیرایا کہ تم جلوس میں گڑبڑ کرنا چاہتے ہو۔ ہمارے نام درج کر لیے۔ اس کے بعد جب حسبِ دستور عصر کی اذان وقتِ مقررہ پر لاؤڈ سپیکر پر دی گئی تو شیعہ کے مبلغ اعظم محمد اسمٰعیل گوجری نے دورانِ تقریر میں ہماری اذان کو یزیدی اذان سے تشبیہ دی اور کہا یہ وہی اذانیں ہیں جو کوفہ میں ہو رہی تھیں جب کہ حسینؓ کا قافلہ اسی طرح لٹا جا رہا تھا۔ اور بعد میں حضرت عائشہ صدیقہؓ پر ناجائز حملے کرنے شروع کر دیے' جو کہ بیان کرنے ہی نامناسب ہیں۔ پھر تقریر میں بلاغ فدک خلافت اور حدیثِ قرطاس کے مضمون بیان کرنے شروع کیے۔

عالی جاہ! ہندستان میں اگر مذہبی رہنما کتاب چھپے جس میں نبی کریمؐ اور عائشہ صدیقہؓ کی

توہین ہو۔ تو جناب اور آپ کی جماعت اور دوسری جماعتیں اور دیگر علماء آپ کے کہنے کہانے پر متفقہ ریزولیشن پاس کر کے اُس کے ضبط کرنے کے لیے غیر حکومت میں پوری جدو جہد کرتے ہیں اور بفضل خدا کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ کیا اس کتاب میں کسی اور عائشہ صدیقہؓ کی توہین ہے اور شیعہ کسی اور عائشہ کی توہین کرتے ہیں؟

جواب:۔ آپ نے نارووال کے جو واقعات لکھے ہیں وہ واقعی بہت افسوسناک ہیں۔ شیعہ حضرات کا یہ حق تو تسلیم کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے کہ وہ اپنے مذہبی مراسم اپنے طریقہ پر ادا کریں، مگر یہ حق کسی طرح بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے لوگ جن بزرگوں کو اپنا مقتدا و پیشوا مانتے ہیں ان کے خلاف وہ برسر عام زبانِ طعن دراز کریں یا دوسروں کے مذہبی شعائر پر علانیہ حملے کریں۔ ان کے عقیدے میں اگر تاریخ اسلام کی بعض شخصیتیں قابل اعتراض ہیں تو وہ ایسا عقیدہ رکھ سکتے ہیں، اپنے گھروں میں بیٹھ کر وہ ان کو جو چاہیں کہیں، ہمیں ان سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن کھلے بندوں بازاروں میں یا پبلک مقامات پر انہیں دوسروں کے مذہبی پیشواؤں پر تو درکنار، کسی کے باپ کو بھی گالی دینے کا حق نہیں ہے اور دنیا کے کسی آئین انصاف کی رو سے وہ اسے اپنا حق ثابت نہیں کر سکتے۔ اس معاملے میں اگر حکومت کوئی تساہل کرتی ہے تو یہ اس کی سخت غلطی ہے، اور اس تساہل کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ یہاں فرقوں کی باہمی کشمکش دبنے کے بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھے۔ دشنام طرازی کا لائسنس دینا اور پھر لوگوں کو دشنام سننے کے لیے اس بنا پر مجبور کرنا کہ اس کا لائسنس دیا جا چکا ہے، حماقت بھی ہے اور زیادتی بھی۔ حکومت کی یہ سخت غلطی ہے کہ وہ شیعہ حضرات کے مراسم عزاداری اور اس سلسلے کے جلسوں اور جلوسوں کے لیے معقول اور منصفانہ حدود مقرر نہیں کرتی اور پھر جب بے قید لائسنسوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی بدولت جھگڑے رونما ہوتے ہیں تو فرقہ وارانہ کشمکش کا رونا روتی ہے۔ اس معاملے میں سنیوں اور شیعوں کی پوزیشن میں ایک بنیادی فرق ہے جسے ملحوظ رکھ کر ہی فریقین کے درمیان انصاف قائم کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ شیعہ جن کو بزرگ مانتے ہیں وہ سنیوں کے بھی بزرگ ہیں اور سنیوں کی طرف سے ان پر کسی طعن و تشنیع کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس سنیوں کے عقیدے

میں جن لوگوں کو بزرگی کا مقام حاصل ہے ان کے ایک بڑے حصہ کو شیعہ نہ صرف یہ کہ برا سمجھتے ہیں بلکہ انھیں برا کہنا بھی اپنے مذہب کا ایک لازمی جز قرار دیتے ہیں۔ اس لیے حدود مقرر کرنے کا سوال صرف شیعوں کے معاملے میں پیدا ہوتا ہے۔ انھیں اس بات کا پابند کیا جانا چاہیے کہ بدگوئی اگر ان کے مذہب کا کوئی جز و لازم ہے تو اسے اپنے گھر تک محدود رکھیں۔ پبلک میں آکر دوسروں کے بزرگوں کی برائی کرنا کسی طرح بھی ان کا حق نہیں مانا جا سکتا۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس معاملہ کو اگر معقول طریقے سے اٹھایا جائے تو خود شیعوں میں سے بھی تمام انصاف پسند لوگ اس کی تائید کریں گے اور ان کے شر پسند طبقے کی بات نہ چل سکے گی۔ حکومت کو بھی بآسانی اس بات کا قائل کیا جا سکے گا کہ شیعہ حضرات کو ان کے مذہبی مراسم کی ادائگی کے معاملے میں، جہاں تک کہ پبلک میں ان کے ادا کرنے کا تعلق ہے، حدود کا پابند بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ حدود بھی گفت و شنید سے طے ہو سکتے ہیں۔ اس مسئلے کو کسی ایجی ٹیشن کی بنیاد بنانے کے بجائے اس طریقے سے حل کرنا زیادہ مناسب ہے۔ میں اپنی حد تک اس خدمت کی انجام دہی کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں اس میں ان شاء اللہ دریغ نہ کروں گا۔

ائمۂ اربعہ اور اہل بیت

سوال: ترجمان ستمبر ۵۶ء میں ایک سوال کے جواب میں آپ نے لکھا ہے کہ "صرف اہل بیت سے علمی استفادہ کرنے کا طریقہ تو خود اہل بیت نے بھی اختیار نہ کیا۔ وہ جس جس کے پاس علم پاتے تھے اس سے استفادہ کرتے تھے"۔ میرے ناقص مطالعہ میں آج تک یہ بات نہیں آئی اور نہ کبھی کسی سے ایسا سنا ہے۔ آپ اس کے ثبوت میں چند معتبر کتب کے حوالے دیں تاکہ مدعا زیادہ واضح ہو جائے۔

مزید سوال صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب الاستخلاف کی ایک حدیث سے متعلق ہے۔ حدیث یہ ہے عن جابر بن سمرة قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول یکون اثنا

عشر امیرا فقال کلمۃ لم اسمعہا. فقال ابی انہ قال کلھم من قریش

اس حدیث میں جن بارہ امراء کا ذکر ہے وہ کون لوگ ہیں۔ اہل تشیع میں سے اثنا عشری حضرات ان سے مراد اپنے بارہ امام لیتے ہیں۔ کیا ان کا یہ استدلال آپ کے نزدیک صحیح ہے ؟

جواب : حضرات شیعہ کی کتبِ حدیث پر تو میری اتنی نگاہ نہیں ہے کہ میں ان کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی بات کہہ سکوں مگر اہل سنت کی کتب حدیث میں بکثرت روایات ایسی موجود ہیں جو بزرگان اہل بیت نے غیر اہل بیت صحابہ یا تابعین یا تبع تابعین سے روایت کی ہیں۔ مثلاً بخاری و مسلم میں متعدد احادیث امام جعفر صادق نے محمد بن منکدر اور عطا بن ابی رباح سے روایت کی ہیں۔ امام محمد الباقر نے بہت سی احادیث جابر بن عبداللہ ابو مرہ مولیٰ عقیل بن ابی طالب، عبداللہ بن ابی رافع، سعید بن مسیّب اور یزید بن ہارون سے روایت کی ہیں۔ امام زین العابدین نے بہت سی احادیث حضرت صفیہ ام المومنین، مسور بن مخرمہ، سعید بن مرجانہ، عمر بن عثمان اور دوسرے اصحاب سے روایت کی ہیں۔ خود حضرت علی نے ایک روایت مقداد بن اسود سے نقل کی ہے جو مسلم میں ملتی ہے۔ یہ تو صرف بخاری و مسلم کی روایات ہیں۔ دوسری کتب کا استقصا کیا جائے تو مزید احادیث اسی نوعیت کی ملیں گی۔ بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ بزرگان اہل بیت نے علم کے معاملہ میں کبھی نہ تعصب برتا ہے اور نہ خاندانی فخر و غرور سے کام لیا ہے۔

بخاری کی جس حدیث کے بارے میں آپ نے سوال کیا ہے یہ حدیث کتاب الفتن میں نہیں بلکہ کتاب الاحکام میں ہے اور اس کا اندراج باب الاستخلاف میں نہیں بلکہ اس کے بعد کے ایک باب میں ہے جو بلا ترجمہ درج ہوا ہے یعنی اس پر کوئی عنوان نہیں ہے۔ بخاری میں یہ روایت بہت مختصر ہے، لیکن مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور طبرانی وغیرہ میں اسی مضمون کی متعدد روایات موجود ہیں جو پوری تفصیل بیان کرتی ہیں اور ان سے اصل مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ان روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ بارہ خلفاء یا امراء (الفاظ مختلف ہیں) کے دور تک اسلام زبردست اور طاقت ور رہے گا، امت ایک نظام میں مجتمع رہے گی اور کسی کی عداوت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ مسلمانوں کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف امراء پر اس پیشین گوئی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے اور بعض لوگوں نے اس کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن بہر حال ان تفصیلات سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان بارہ امراء یا خلفاء سے مراد ائمۂ اثنا عشر نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے ہاتھ میں حکومت نہیں رہی۔

مطبوعات

امامیہ مشن کا مزید لٹریچر

اس سے پہلے ہم امامیہ مشن کے بھیجے ہوئے پمفلٹوں کا تعارف کرا چکے ہیں۔ مزید پمفلٹ موصول ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم ان کتابچوں پر الگ الگ اظہار رائے کرنے کے لیے جگہ نہیں رکھتے۔ مجموعی طور پر ہمارا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ شیعیت کی تبلیغ کے لیے نسبۃً بہتر اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور نظریۂ امامت سے لے کر مسلک تبرا و تقیہ تک تمام اجزا کی توجیہ کچھ عقلی سے انداز سے کی گئی ہے۔ مگر گفتگو کا معیار عوام کی ضرورت کے مطابق ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ پیش نظر نہیں معلوم ہوتا۔ ابکی جو پمفلٹ آئے ہیں یہ عنوانات کے لحاظ سے نظام اجتماعی سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ صرف ہمارے ہاں کے مروجہ لٹریری فیشن کا ایک تقاضا پورا کیا گیا ہے۔ اصل بحثیں اور مندرجات محض مذہبی اور اخلاقی قسم کی ترغیبات پر مشتمل ہیں۔ آج جو اجتماعی مسائل و مباحث دنیا میں پیدا ہو چکے ہیں اور مسلمان اقوام پر اثر انداز ہو رہے ہیں ان کی تشخیص و تجزیہ اور ان کا سائنٹفک حل نکالنے کے لحاظ سے یہ لٹریچر کامیاب نہیں ہے۔ مثلاً اسلام کے نظریۂ سیاست و حکومت پر بہت سے اوراق لکھے ملتے ہیں لیکن ان میں صرف یہ نکات پیش کیے گئے ہیں کہ اسلام جمہوریت کے خلاف ہے، اسلامی نظام امام معصوم ہی کے ذریعے چل سکتا ہے۔ امام معصوم کو کام کرنے کے لیے اگر مناسب معاشرہ نہ ملے تو وہ میدان کشمکش سے ہٹ کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ آج بھی وقت کا امام معصوم غائب ہے۔ خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں شیعی نظریہ پوری طرح اس لٹریچر میں کارفرما ہے، مگر زبان ذرا محتاط استعمال کی گئی ہے۔

پمفلٹ بیشتر علامہ سید نقی علی النقوی مجتہد العصر کے قلم سے ہیں۔ دو رسائل ذاکر حسین صاحب فاروقی اور جناب اسد علی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔ قیمتیں حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ آثار قدرت ۳ ر حقیقت اسلام ۳ ر اسلامی نظریۂ حکومت ۳ ر نظام زندگی (۱۱ ۱۲ ر عورت اور اسلام ۳ ر مادیت کا

علمی جائزہ ۳ر تجارت اور اسلام ۱۰ر اسلام اور انسانیت ۸ر جمہوریت اور اسلام ۱۲ر معصوم شہزادی ۳ر نظام زندگی (۲) ۱۲ر شیعیت کا تعارف ۵ر اسلامی تمدن۔ قیمت نامعلوم۔ واقعۂ کربلا کی اہمیت ۲ر

پلاننگ پر ایک تنقیدی نظر

از جناب عظمت اللہ خاں صاحب ایم اے (عثمانیہ)
ناشر: مکتبہ سیل نو، جدید آغاپورہ۔ حیدرآباد۔ دکن قیمت ۱۲ر

یہ کتاب درحقیقت ماہ نامہ "سیل نو" کی ایک اشاعت خاص ہے۔ نہایت ہی اہم موضوع پر بحث اٹھائی گئی ہے اور اغلباً اردو زبان میں پہلی کوشش ہے۔ بے جا نہ ہوگا' اگر ہم اردو لٹریچر میں اسے ایک قابل قدر اضافہ قرار دیں۔ آج سرمایہ دارانہ نظام کی بے قید معیشت کے ردِ عمل نے اشتراکی اصولوں پہ مکمل معاشی منصوبہ بندی کا جو سسٹم پیدا کر دیا ہے وہ تقاضا کرتا ہے کہ اس کے اچھے اور برے پہلوؤں کا بے لاگ جائزہ لیا جائے۔ اس ضرورت کو پیش نظر کتاب قابل اطمینان حد تک پورا کرتی ہے۔ اس میں بے قید معیشت کا بھی ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل جمہوری اور اشتراکی طریق منصوبہ بندی کو تحقیقی انداز سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ جناب مؤلف کا مطالعہ خاصا وسیع اور انداز بحث سلجھا ہوا منطقی ہے۔ اشتراکی نظام منصوبہ بندی کے تحت ذرائع و وسائل کے انضباط کے ساتھ خود انسانوں کی مکمل منصوبہ بندی جس طرح کی جاتی ہے' تہذیب و تمدن کے لیے اس کا عمل انتہائی خطرناک ثابت ہوا ہے۔ کاش کہ اس پہلو سے بھی ذرا زیادہ واضح بحث ہو جاتی۔ جمہوری پلاننگ کی ایک کمزوری کا ذکر نہیں ہو سکا اور وہ یہ ہے کہ نظام جمہوریت میں فیصلے اور اقدامات بڑی سست رفتار تدریج سے نمودار ہوتے ہیں' کیونکہ رائے عام کو ایک ایک امر میں تیار کرنے اور ساتھ لینے کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ یہ جمہوری معمول جہاں مفید ہے وہاں منصوبہ بندی کی وسیع ذمہ داریاں پوری کرنے میں کمزور ثابت ہوتا ہے۔ مؤلف کا ناقدانہ نقطۂ نظر منفی قسم کا نہیں بلکہ وہ اسلامی نظریۂ زندگی پر شعوری ایمان رکھنے کے سبب ایک مثبت مقصدیت کے علم بردار ہیں۔ چنانچہ موصوف نے تکمیل مبحث میں اسلامی نظریۂ معیشت کو پیش کر کے یہ واضح کیا ہے کہ یہ نظریہ بے قید معیشت اور اشتراکی منصوبہ بندی میں جکڑی ہوئی معیشت'

دونوں کے مفاسد سے نجات دلانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ درحقیقت بحث کا یہ مثبت پہلو کچھ زیادہ تفصیل اور وضاحتِ بیان کا متقاضی تھا، کیونکہ ایک اجنبی ماحول میں کسی نئے نظریہ کو مؤثر طور پر نمایاں کرنے کے لیے غیر معمولی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مؤلف نے اسی حصے میں اجمال سے کام لیا ہے اور ان کے بعض تصورات مبہم ہو کر رہ گئے ہیں۔ کتاب میں انگریزی اصطلاحات تو آنی ہی تھیں، افسوس ہے کہ ان کے تراجم اچھے معیار کے نہیں ہیں۔ کتابت و طباعت بھی کسی قدر کمزور ہے۔ ان کمزوریوں کے باوجود کتاب معنوی اور افادی حیثیت سے خاصا وزن رکھتی ہے اور اس موضوع سے دلچسپی لینے والے حلقوں کو اس کی قدر افزائی کرنی چاہیے۔

تحقیق فدک

تالیف جناب احمد شاہ صاحب بخاری۔ پتہ:۔ مدرسہ عربیہ دار الہدیٰ، چوکیرہ ضلع سرگودھا۔ قیمت دو روپے۔

مسئلۂ فدک میں جو سیزدہ صد سالہ بحث شیعہ و سنی گروہوں کے درمیان چلی آرہی ہے اس کتاب میں اس پر سنی نقطۂ نظر سے شیعوں کی مستند کتابوں کے حوالے جمع کیے گئے ہیں اور بہ حیثیتِ مجموعی خاصا مواد یک جا ملتا ہے۔ کتاب کا مزاج مناظرانہ ہے جیسا کہ عنوان کے سامنے آنے سے توقع ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک طرف سے جب مناظرانہ ادّعا کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کا ردّ عمل پیدا ہوتا ہے۔ مگر تجربہ سے ظاہر ہے کہ یہ رنگ افہام و تفہیم اور اصلاح و تعمیر نہیں پیدا کرسکتا۔ پس زیادہ بہتر یہ ہوتا کہ فدک کے بارے میں خالص اثباتی انداز سے سائنٹفک بحث کی جاتی اور شیعہ گروہ کو منوالنے کی بے کار کوشش کے بجائے عام انسانی ذہن کو مطمئن کیا جاتا۔

عجمی مذاہب کا اثر مسلمانوں کے عقائد پر

از خواجہ عباد اللہ صاحب اختر۔ شائع کردہ: مرکزی مکتبہ تحریک تجدید عہد، وطن بلڈنگ لاہور۔ قیمت عہ

اس کتاب میں اصل بحث یہ اٹھائی گئی ہے کہ کن کن خارجی اثرات کے تحت گوناگوں فرقے اسلام میں نمودار ہوئے۔ لیکن دائرہ بحث مجرد تاریخی تحقیق تک محدود نہیں، اس کا اصل مدعا نظریاتی تلقین ہے۔ مؤلف کے دل میں کچھ اچھے داعیات بھی کارفرما ہیں، لیکن ان کے ساتھ متجددانہ نظریات کے

آملنے سے الجھنوں کا ایک عجیب ملغوبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس دور کے کچھ محققین نے اسلام کو گویا "آرٹ" کا میدان بنا لیا ہے کہ ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر ندرت اور جدت طرازی کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ بدقسمتی سے خواجہ اختر صاحب ان محققین سے اثر لے بیٹھے ہیں۔ اسی سبب سے ایک باب حدیث کی تردید میں رقم ہوا، ایک باب میں عصمت انبیاء کے اجماعی تصور کی سخت تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ تصور "مسیحیت" سے اخذ کیا گیا ہے، اسی طرح سلمان فارسیؓ کی شخصیت سے انکار کر کے خواجہ صاحب نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا ہے۔ آخری حصے میں غیر مسلم قوموں کے نفوذ کے خلاف جذبۂ احتجاج کا اظہار کر کے مسلمانوں کو رہ نمائی دی گئی ہے کہ وہ قرآنی احکام کے مطابق اغیار سے دوستی و ولایت کا تعلق نہ رکھیں۔ خواجہ صاحب کی تحریر میں ایک کمزوری بڑی نمایاں ہے جو خود ان پر واضح ہے۔ یعنی بقولِ موصوف "ایک بات جس کی طرف مجھے اکثر توجہ دلائی گئی ہے یہ بھی ہے کہ میں جس موضوع پر کچھ لکھتا ہوں، ضمناً اس میں بے تعلق باتیں بھی بیان کر جاتا ہوں۔" کیا مرکزی مکتبہ تحریکِ تجدید عہد زیادہ مفید قسم کی کتابیں شائع نہیں کر سکتا؟

مقامِ حسینؓ

از جناب پیام شاہجہاں پوری۔ ناشر: اشاعت منزل لاہور۔
قیمت مجلد مع گرد پوش ۱۲/

تاریخ اسلام کی ممتاز شخصیت سیدنا امام حسینؓ کی سیرت و سوانح اور واقعۂ کربلا کے متعلق یہ کتاب بہت اچھا معلوماتی مواد پیش کرتی ہے جسے مناسب طریق سے مرتب کیا گیا ہے اور ادبی زبان میں بیان کیا ہے۔ چند سطری تعارف جناب غلام رسول مہر نے لکھا ہے جن سے مؤلف نے ذہنی مدد بھی حاصل کی ہے۔ آخر میں امام حسین کے متعلق غیر مسلموں کے آراء و تاثرات درج ہیں۔

سہل قواعد تجوید

از قاری سید کلیم اللہ حسینی۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ نشاۃ الثانیہ، حیدر آباد، دکن۔ قیمت ۸/

ہر زبان تقاضا کرتی ہے کہ اس کی آوازوں کو ٹھیک ٹھیک اسی لہجے اور حسن انداز سے ادا کیا جائے جو اہل زبان کے معیاری ذوق کے مطابق ہو۔ خصوصاً شعر و ادب کے اعلیٰ ترین شہ کاروں کو پڑھتے ہوئے

زبان کے صوتی حُسن کو برقرار رہنا چاہیے۔ ورنہ سُوئے لہجہ سے ادب کا معنوی جمال برباد ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی شخص غالب اور اقبال کے اشعار کو پنجاب کے دیہاتی لہجے پر پڑھے تو اہلِ ذوق سر پیٹ کر رہ جائیں گے۔ آج مشنری اسکولوں میں ہمارے مغرب زدہ حضرات محض اس لیے بصرفِ زرِ کثیر بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں کہ ان کے آلاتِ صوت انگریزی الفاظ کو اصل لہجے میں ادا کرنے کے لیے شروع ہی سے تیار ہو جائیں۔ اسی کا تقاضا عربی زبان بھی کرتی ہے جو ہماری دینی زبان ہے۔ خصوصیت سے قرآن جو کلام الٰہی ہونے کے لحاظ سے انتہائی تقدس رکھتا ہے اور ساتھ کے ساتھ بلند ترین ادبی شکوہ کا حامل ہے اپنے پڑھنے والوں سے حُسنِ ادا کا مطالبہ کرتا ہے۔ قرآن کا حق جہاں یہ ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے وہاں یہ بھی ہے کہ اسے سنوار کر پڑھا جائے۔ قرآن کو معیاری عربی لہجے کے مطابق سنوار کر پڑھنے کی رہ نمائی جس علم سے حاصل ہوتی ہے اس کا نام تجوید ہے۔ پیشِ نظر رسالہ اسی علم کے لیے خاص ہے۔ اور اردو زبان میں مبتدیوں کو رہ نمائی دینے کے لیے سادہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ عام لوگوں کے لیے مفید رہے گا۔

انجمن حُروف القرآن کا بنگلہ لٹریچر

مرتب و ناشر: انجمن حروف القرآن، مشرقی پاکستان۔

بنگلہ زبان داخلی طور پر دو بڑی شاخوں میں منقسم ہے۔ ایک شاخ پوری طرح ہندوانہ خرافیات (Mythology) اور کلچر کی ترجمان ہے۔ اور دوسری شاخ وہ ہے جس نے مسلم فکر و تمدن کے اثرات اپنے اندر جذب کیے ہیں۔ بنگال کی قسمت کو بگاڑنے کے لیے جو سازشیں انگریزی دور سے چلی ہیں اور جن کے تحت ہندوؤں نے سیاسی و معاشی غلبے کے زور سے تعلیم اور ادب کے دائرے میں اپنا تسلط جمایا ہے، ان کا نتیجہ یہ رونما ہو کے رہا کہ بنگلہ کی ہندو شاخ فضا میں خوب پھیلی اور اس نے مسلم شاخ کے نشو و ارتقا کو روک دیا۔ مسلم شاخ علما اور مذہبی خاندانوں اور دیہات میں باقی تو رہی لیکن تعلیم اور ادب کے دائرے سے اسے خانہ بدر کر دیا گیا۔ ماضی قریب میں کچھ درد مند مسلمانوں کو اس نقصان کا احساس ہوا اور خاص طور پر پاکستان بننے کے بعد ان میں یہ تحریک رونما ہوئی کہ وہ ہندو بنگلہ کے تسلط سے نکلیں اور مسلم بنگلہ کو پروان چڑھائیں۔ لیکن مقابلے میں نہایت مضبوط طاقت کے ہونے اور اپنی حکومت سے

کوئی مدد نہ ملنے کے سبب وہ حالات کو پلٹا تو نہ دے سکے۔ البتہ انہوں نے عزم و ہمت کے بل پر کام کو جاری رکھا۔ ایسے ہی کچھ مردانِ کار نے "انجمن حروف القرآن" کی تشکیل کی۔ اس انجمن نے مسلم بنگلہ کی آبیاری شروع کی۔ جو لٹریچر اس ادارے کی طرف سے سامنے آیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم بنگلہ میں عربی فارسی کا معتدبہ ذخیرہ الفاظ موجود ہے جو اسے اردو کے بالکل قریب لے آتا ہے۔ نیز انجمن نے عربی رسم الخط اختیار کرکے اردو بنگلہ ملاپ کے لیے اور زیادہ سہولت پیدا کردی ہے۔ ان خطوط پر اگر جم کر کام کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ چند برس میں اردو بنگالی قضیے کو بہ آسانی حل نہ کرلیا جائے اور پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے لسانی بُعد کو گھٹا نہ لیا جائے۔ سارا فساد بنگلہ کی ہندو شاخ کے سبب ہے جو چھائی ہوئی ہے اور جسے اس کے سرپرست اپنے زیر اثر مسلمانوں کی مدد سے اسی طرح غالب رکھنا چاہتے ہیں۔

موصولہ لٹریچر بہت خوب صورت معیارِ طباعت کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ پمفلٹوں اور رسالوں کے ناموں کی فہرست یہ ہے: گلدستہ بنگلا، حساب پرکتاب (پہلا حصہ)، نماز پر معنی، پاک بنگلا و قرآن شِکھا، تعلیم الاسلام (پہلا حصہ)، راہِ نجات، خواتین اسلام، عید الاضحیٰ، میلاد النبی، یوم آزادی پاکستان، نصاب تعلیم وغیرہ۔ دو تین پوسٹر بھی ہیں۔ چاہیے کہ مغربی پاکستان میں اس لسانی تحریک کے حق میں پروپیگنڈہ ہو اور کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کی جائے۔

عفت ــ سالگرہ نمبر

بہ ادارت: عبدالوحید خاں، حمیدہ بیگم، رخشندہ کوکب۔ مقام اشاعت: اچھرہ لاہور۔ قیمت سالگرہ نمبر ۸؍

"ادارۂ خواتین" کے اجرا کردہ اس جریدے کا ہم پہلے تعارف کراچکے ہیں۔ اس جریدے کا مقصود صنفِ نازک کو قدیم جاہلیت اور جدید جاہلیت دونوں کے تسلط سے نکال کر اسلامی سرچشمۂ فکر و تہذیب سے حیاتِ نو دلانا ہے۔ ملک کے اسلام پسند عناصر کے لیے یہ امر موجبِ مسرت ہوگا کہ یہ جریدۂ خواتین میں خوب مقبول ہو رہا ہے اور اپنا ایک مقام پیدا کرچکا ہے۔ اب یہ اپنا اولیں سالگرہ نمبر پیش کر رہا ہے۔ لکھنے والوں کی فہرست، تعلیمی، معلوماتی اور تفریحی مواد کی مقدار، نگارشات کے تنوع اور افادیت و مقصدیت کے لحاظ سے یہ نمبر عفت کے سفرِ حیات کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔ خواتین کے دائرے میں یہ نمبر بطور تحفہ دیے جانے کے لیے بہت ہی موزوں ہے۔ افسوس ہے کہ ہم مندرجات

"بقیہ اشارات"

اس معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لیے دو بظاہر متماثل چیزوں کا جوہری فرق اچھی طرح ذہن نشین ہونا چاہیے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ مجموعی نظام زندگی کی تبدیلی چاہنے والا دوسری تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی نظام کی تبدیلی چاہنے سے کسی طرح صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سیاسی نظام کی تبدیلی آپ سے آپ اس امر کی مقتضی ہے کہ اقتدار ان لوگوں کی طرف یا اُن کی پسند کے لوگوں کی طرف منتقل ہو جو اس تبدیلی کے خواہشمند ہوں۔ مگر فرق اور بہت بڑا فرق ہے "اپنے لیے" اقتدار چاہنے اور اپنے اصول و نصب العین کے لیے اقتدار چاہنے میں۔ اصول کا اقتدار چاہے عملاً اصول کے علمبرداروں ہی کا اقتدار ہو، پھر بھی "اصول کا اقتدار" چاہنا، اور اس کے علم برداروں کا "اپنے لیے اقتدار چاہنا" حقیقۃً دو الگ الگ چیزیں ہیں جن میں روح اور جوہر کا بہت بڑا فرق ہے۔ نیت کا کھوٹ دوسری چیز میں ہے نہ کہ پہلی چیز میں، اور مجاہدۂ نفس جس چیز پر مرکوز ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ پہلی چیز کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادینے پر بھی دوسری چیز کا شائبہ تک ذہن میں نہ آنے پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے مجموعی نظامِ زندگی کو بدل کر اسلام کے اصولوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کی، یہ چیز سیاسی غلبہ و اقتدار کی بھی متقاضی تھی کیونکہ دین کو پوری طرح غالب کردینا اس کے بغیر ممکن نہ تھا، اور عملاً اس جدوجہد کے نتیجے میں اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا بھی، لیکن اس کے باوجود کوئی ایماندار آدمی یہ شبہ تک نہیں کرسکتا کہ ان کی جدوجہد کا مقصود "اپنا اقتدار" تھا۔ دوسری طرف "اپنے" اقتدار کے طالبوں سے تاریخ بھری پڑی ہے، اور تاریخ میں ان کو ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے وہ دنیا میں موجود ہیں۔ عملاً اقتدار پانے کو اگر صرف ایک واقعہ کی حیثیت سے لیا جائے تو دونوں گروہوں میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن نیت کے لحاظ سے دونوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اس فرق پر دونوں کا کردار ـــــ جدوجہد کے دَور کا کردار بھی اور کامیابی کے دَور کا کردار بھی ـــــ ناقابلِ انکار شہادت دے رہا ہے۔

جو لوگ صدقِ دل سے اصولِ اسلام کے مطابق نظام زندگی کا ہمہ گیر اقتدار چاہتے ہوں انہیں فرداً فرداً بھی اس فرق کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی نیت درست رکھنی چاہیے، اور ان کی جماعت کو مجموعی طور پر بھی اس امر کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ "اپنا اقتدار چاہنے" کی نیت کسی شکل میں بھی اس کے دائرے میں جگہ نہ پاسکے۔

ترتیب: محمد ایوب

خـــالی صفحـــه

Our English Literature

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study.

PP. 231-Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic way of thought and life, and our present social and political problems.

PP. 72-Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet.

PP. 64-Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows.

PP. 56-Price As. 14

5. **Economic Problem of man & Its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi

PP. 55-Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944

PP. 56-Price As. 12

7. **What is Islam?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi

PP. 96-Price Re. 1/8

8. **After Secularism what?**—By Mohammad Mazahr-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements.

PP. 56-Price As. 12

9. **Maudoodi on Islamic Law and Constitution**—

Price Rs. 4/8

Can be had from

Markazi Maktaba-e-Jamat-e-Islami Pakistan

Ichhra LAHORE